مجلس ادارت

سلسلۂ اسلام اور مستشرقین

فروری ۱۹۸۲ء میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر دارالمصنفین کے اہتمام میں جو بین الاقوامی سمینار ہوا تھا، اس کے سلسلہ میں اسی عنوان پر دارالمصنفین نے ایک اہم اور نیا سلسلۂ تالیفات شروع کیا ہے جس کی اب تک پانچ جلدیں مرتب ہو چکی ہیں۔

جلد ۱ اس میں جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب کے قلم سے اس سمینار کی بہت ہی مفصل اور دلچسپ روداد قلم بند ہوئی ہے۔ قیمت ۲۰ روپے۔

جلد ۲ اس میں وہ تمام مقالات جمع کر دیے گئے ہیں جو اس سمینار میں پڑھے گئے تھے اور جو معارف ۸۲ء سے لے کر ۸۳ء تک سلسلہ وار شایع بھی ہو چکے ہیں۔ قیمت ۳۴ روپے

جلد ۳ اس میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر سمینار کے علاوہ جو مقالات لکھے گئے ہیں، اور معارف میں شایع بھی ہو چکے ہیں، جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۳۲ روپے۔

جلد ۴ تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر مستشرقین کے اعتراضات کے جواب میں علامہ شبلی نعمانیؒ کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۳۳ روپے۔

جلد ۵ اسلامی علوم و فنون سے متعلق مستشرقین کی قابل قدر خدمات کے اعتراف کے بعد ان کے اسلام اور تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اعتراضات کے جواب میں مولانا سید سلیمان ندوی کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۲۰ روپے۔

"منیجر"

جلد ۱۴۶ ماہ ربیع الآخر ۱۴۱۱ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۹۰ء عدد ۵

مضامین

شذرات

انگریزوں کی سیاسی غلامی سے ملک ضرور آزاد ہوگیا ہے، لیکن ذات پات اور طبقہ واریت کے بندھنوں میں وہ پوری طرح جکڑا ہوا ہے، مذہبی تعصب اور فرقہ وارانہ جنون کی لہریں اٹھ اٹھ کر ملک کی بنیادوں کو کمزور اور کھوکھلا کر رہی ہیں، معاشی اور سیاسی استحصال بدستور جاری ہے، اقلیت کو اکثریت کی چیرہ دستیوں سے نجات نہیں مل رہی ہے، چھوٹی قومیں اور پس ماندہ طبقے بڑی قوموں اور اونچے طبقوں کا تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں، جس چمن کو زیب اس کے اختلاف سے تھا، اس کی رنگارنگی کو مٹا دینے کے لیے تشدد اور جارحیت پر آمادہ افراد اور جماعتیں متحد ہوگئی ہیں، آخر ہمارے سیاسی رہنما اپنے حقیر اور گھٹیا مفاد کے لیے ملک و قوم کی قسمت کو کب تک داؤں پر لگاتے رہیں گے۔

رزرویشن کے خلاف جو طوفان بدتمیزی برپا تھا اسی نے ملک کی چولیں ہلا دی تھیں، اس میں جو کچھ کسر رہ گئی تھی اسے رجعت پسند اور فرقہ پرور جماعتوں نے پورے ملک خصوصاً اترپردیش میں نفرت، اختلاف اور مذہبی جنون کی آگ بھڑکا کر پوری کردی، وہ اکثریت کے گھمنڈ اور طاقت کے نشے میں سینکڑوں برس پرانی مسجد کو ڈھا کر اس کی جگہ مندر تعمیر کرنے کیلئے اس زور و شور سے اٹھیں کہ آئین و انصاف اور قانون سب کو بالائے طاق رکھ دیا جس کے نتیجے میں ہر طرف فسادات پھوٹ پڑے اور پرامن شہریوں کی جان پر بن آئی، لیکن خدانے وقت کے ابرہہ کے لشکر جرار کو ذلیل و خوار کردیا، مسٹر وی۔ پی۔ سنگھ کی مرکزی اور مسٹر ملایم سنگھ کی صوبائی حکومت نے مسجد کی اینٹ سے اینٹ نہ بجنے دی، اور شرپسندوں نے امن و امان کو درہم برہم کرنے اور مسلمانوں کے قتل و غارت گری کا جو منصوبہ بنایا تھا وہ خاک میں مل گیا، ہندوستان کے سیکولرازم اور انصاف پسندی کی لاج رکھ لینے پر ہم مسٹر وی۔ پی۔ سنگھ اور مسٹر ملایم سنگھ کو مبارکباد دیتے ہیں۔

لیکن اس قضیہ کا انجام بخیر نہیں ہوا، اور مسٹر وی۔ پی۔ سنگھ کو اپنی سیکولر پسندی کی قیمت ادا کرنی پڑی، ابھی ان کی حکومت کا ایک برس بھی پورا نہیں ہوا تھا، اس تھوڑے عرصے میں بھی بار بار طوفان اٹھے اور حکومت کی کشتی ہچکولے کھانے لگی مگر ناخدا کی تجربہ کاری اور دوراندیشی کام آتی اور کشتی کو بچاتی رہی، لیکن رجعت پسندی، مذہبی تنگ نظری اور فرقہ پروری کا یہ سیلاب اس طرح امنڈ آیا کہ ناخدا کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ کشتی کو پار لگانے میں ناکام رہا، شروع ہی سے خیال تھا کہ شاخ نازک پر بننے والا آشیانہ ناپائدار ہوتا ہے، اور مختلف و متضاد عناصر کے سہارے چلنے والی حکومت کا خاتمہ یقینی ہے، لیکن اس کا خیال نہ تھا کہ خود جنتا دل دو ٹکڑوں میں بٹ جائے گا، سیکولر پسند طاقتوں کا شیرازہ بکھر جائے گا اور مسٹر وی۔ پی۔ سنگھ اور مسٹر ملایم سنگھ جن کی حکومت کو بھی خطرہ لاحق ہوگیا ہے، کا رخ دو مختلف سمتوں میں ہو جائے گا۔

دراصل اس وقت یہ دونوں سیاسی رہنما سیکولرازم اور ترقی پسندی کی علامت بن گئے تھے، دونوں قانون کی بالادستی کو ختم کرنے اور سیکولرازم کی دھجیاں بکھیرنے والی قوتوں کے خلاف سرگرم جدوجہد میں مصروف تھے، اور پسماندہ اور غریب طبقوں کو اوپر اٹھانے اور اقلیتوں کو امن و تحفظ کی ضمانت دینا چاہتے تھے، جو فرقہ پسندوں اور اقلیتوں کی زبانی ہمدردی اور غریبی مٹانے کا دم بھرنے والوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا، اب جنتا دل کی ٹوٹ پھوٹ کا فائدہ کس کو ہوگا؟ کیا اس سے مظلوم اور محروم طبقوں کی بے چینی اور بے اعتمادی میں اضافہ نہ ہوگا، اور رجعت پسندوں اور سرمایہ داروں کے حوصلے بلند نہ ہوں گے، جمہوریت میں قیادت کی تبدیلی معیوب نہیں ہے لیکن اس کے لیے جمہوری طریقوں اور روایتوں کو اختیار کیا جانا چاہیے تھا، یا پھر مسٹر وی۔ پی۔ سنگھ اور ان کے گروپ کو عالی ظرفی کا ثبوت دینا چاہیے تھا، تاکہ پارٹی کا اتحاد قائم رہتا۔

نئے منتخب ہونے والے وزیر اعظم مسٹر چندر شیکھر پرانے اور تجربہ کار سیاست داں ہیں، مگر وہ پہلی مرتبہ حکومت میں شامل ہوئے اور اس کے سب سے بڑے عہدہ پر فائز ہوئے

سوشلزم اور سیکولرازم پر ان کا مضبوط عقیدہ ہے، کانگریس کی تقسیم کے وقت وہ مسز اندرا گاندھی کے ترقی پسندانہ خیالات اور انقلابی اقدامات کی وجہ سے ان کے ساتھ تھے، مگر ۷۵ء میں ایمرجنسی کے خلاف ہونے کی بنا پر انھیں بھی گرفتار کرلیا گیا، وہ عرصہ تک جنتا پارٹی کے صدر رہے، پھر جنتا دل میں آئے اور اب اس سے منحرف ہونے کے بعد کانگریس کی تائید سے وزیر اعظم منتخب ہوئے ہیں، ان کے اور ان کی حکومت کے بارے میں ملے جلے ردعمل کا اظہار کیا جارہا ہے، وہ اقلیتوں اور کمزور طبقوں کے شروع ہی سے حامی رہے ہیں اور ان کے مسائل کے بارے میں ان کے بعض حقیقت پسندانہ خیالات عام قومی رہنماؤں سے بالکل مختلف رہے ہیں جن کا وہ کھل کر اظہار بھی کرتے رہے ہیں، وزیر اعظم ہونے کے بعد بھی انھوں نے کہا ہے کہ پس ماندہ طبقوں میں احساس محرومی ختم کرنے اور اقلیتوں کے شبہات کو دور کرنے کی کوشش کریں گے اور ملک کے بہتر مستقبل کو یقینی بنائیں گے۔

پچھلے چند ہفتے خصوصیت سے اترپردیش کے مسلمانوں پر بڑے سخت گذرے ہیں لیکن انھوں نے پہلی مرتبہ یہ محسوس کیا کہ انتظامیہ ان کے تحفظ کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داری انجام دے رہی تھی، کیونکہ حکومت نے امن و امان کو باقی رکھنے کا تہیہ کرلیا تھا، حکومتیں تو آتی جاتی رہیں گی، اور ان کے پروگرام اور پالیسیاں بدلتی رہیں گی، سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے مسائل کا پائدار اور مستقل حل کیا ہے، قرآن مجید انسان کے اعمال بد کو فساد کی اصلی وجہ بتاتا ہے ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ، اس لیے مسلمانوں کو اپنے عقائد و اعمال کی اصلاح اور تعلق باللہ کو مضبوط کرنا ہوگا، وہ اپنے دین و مذہب سے منحرف اور برگشتہ ہوکر اپنے ملی اثاثے اور قومی سرمایے کو محفوظ نہ رکھ سکیں گے۔

جن مخلصین نے دارالمصنفین اور اسکے خدمت گذاروں کی خیریت معلوم کرنے کے لیے خطوط لکھے ہیں انکو فرداً فرداً جواب دینا ممکن نہیں، ہم ان سب کے تہ دل سے شکر گذار ہیں، الحمدللہ یہاں امن رہا۔

مقالات

فارسی کی سب سے قدیم طبی تصنیف

از

پروفیسر نذیر احمد۔ علی گڑھ

(۲)

حکیم میسری ہڈی ٹوٹنے پر ہڈی جوڑنے والے کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت کرتا ہے، مؤلف کے نزدیک دوسرے قسم کا علاج بے سود ہوگا:

وگرآں استخوانش شد شکستہ	وزیرا استخوانش گشتہ خستہ
مگر استاد کس باشد گزیدہ	کہ نیک و بد بسی بسیار دیدہ
کہ وے ایں درد را دارو تواند	شکستہ استخواں برہم نشاند
نباید کس بدیں مشغول بودن	بدارو کردن او را غم فزودن
کہ ایں کار خدائے آسمانست	علاج ایں زمخلوقش نہانست
علاج ایں بیزداں دست بادار	چہ افزائش دیحک رنج دآزار

حکیم میسری کے نزدیک کچھ ایسے امراض ہوتے ہیں جن کا علاج بجز دعا کے اور کچھ نہیں، وہ خود مریض کے اپنے ذاتی کردار کا نتیجہ ہوتے ہیں، کسی نے بیحد گناہ کیا ہوتا ہے، کسی نے دوسروں پر ظلم کیا ہوتا ہے، ایسے مریض کا علاج دعا

وصدقہ ہے، مؤلف کہتا ہے :

وباشد دردہائے آسمانی   کہ بی شک در علاج او بمانی
مگر کس را بی اندازہ گناہست   کہ نزدش دردہا را ایش راہست
دگرنہ بعیتی زی او رسیدست   کہ زاں بغیت مگراین درد دیدست
دگرنہ برکسی بیداد کردست   ز بیدادیش کس اندوہ خوردست
دعا کردست بروی زی خداوند   کہ یارب تو چنیں بیداد مپسند
خداوندایں دعائے او شنیدست   از نیش درد و بیدادی رسیدست
ندارد سود وی را ہیچ درماں   مگر گیرد فرستد امر و فرمان
مرایں کس را دعا و صدقہ باید   کہ دردش بیگماں صدقہ زداید
بہ از صدقہ نباشد ہیچ درماں   کہ باایزد بیآید عہد و پیمان
الٰہی دردہا را پاک یکساں   بجملہ از مسلماناں بگرداں
مکن ما را نیاز و مند دارو   نیاد ما ہمیشہ یاد زی تو

موت اور پیری

میسریؔ نے سچ لکھا ہے کہ موت اور پیری کا کوئی علاج نہیں، اس موضوع پر اس نے پند و نصیحت میسری حکیم کے عنوان سے بڑی شرح و بسط سے گفتگو کی ہے۔

شروع میں اس نے کتاب کے مندرجات کا اجمالی بیان کیا ہے : ص ۲۶۶

من ایں نامہ بکام دل بگفتم   بسی علم اندریں نامہ نہفتم
نشان دردہائے گونہ گونہ   بگفتم من ترا چون و چگونہ
علاج دردمنداں نیز گفتم   بہ ہر دردی علاجی چند جستم
و نام دارو و ہم طبع دارو   دریں نامہ بگفتستیم ہر دو

ز مطبوخ و حبوب و قرص و معجون   گوارش ہائے پاک و نیک موزوں
لعوق از چند گونہ با طریفل   شراب از چند گونہ با سفرجل
طلی و شافہائے تیز و مرہم   ضماد و نہہائے نیک محکم
سعوط از چند گونہ چند روغن   سفوف از چند گونہ چند سودن
زیادہ چند گونہ چند تریاک   سموم از چند گونہ گفتہ ام پاک
خمار سرشتہ چند گونہ چند پختہ   غذائے دردمنداں نیز گفتہ
نماند اندر جہاں از دارو و درد   ز تر و خشک نیز از گرم و سرد
کہ نہ در نامہ ام در، یاد کردم   بسی دلہای غمگیں شاد کردم
ولیکن مرگ را چارہ ندانم   بجائے مرگ بیچارہ مانم
طبیب از مرگ را چارہ تواند   نخستیں خویشتن را زو رہاند
کہ از دارو کسی بہتر نگردد   و درد از دارو کمتر نگردد
بہر حالی طبیباں را نگہ دار   مراشاں را تو ہرگز بر میازار
کہ با تدبیر تو تقدیر جبار   نسازد بہ نگردد ہیچ بیمار
نہ ہر دردی ز دارو گشت بہتر   نہ دارو ہر کسی را ہست درخور
کہ مرگ آید ندارد سود تریاک   بوقت مرگ چہ تریاک و چہ خاک

اس کے بعد موت کے ساتھ پیری کا ذکر کرتا ہے :

شکستہ پای و درد سال فرسود   ندارد مومیای نزد او سود
خبر گفتست پیغمبر دریں دو   بمرگ و ہم بہ پیری نیست دارو
و باشد دردہائے آسمانی   کہ بی شک در علاج او بمانی

باب النصیحۃ کے ذیل میں اس نے بیماری اور طریق علاج کے بارے میں بڑی مفید باتیں درج کی ہیں، بیماری کا سبب جاننا طبیب کے لیے نہایت ضروری ہے، طبیب کو اس کی نبض، اس کے پیشاب، اس کے چہرے کے رنگ سے بڑی مدد مل سکتی ہے، اگر مرض کا سبب نہ معلوم ہو تو علاج مفید نہ ہوگا، پرہیز دوا سے زیادہ مفید ہے، چھ چیزوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے (۱) جس چیز کے کھانے سے تکلیف ہو جائے اس سے پرہیز کرنا چاہیے (۲) اگر معدہ کوئی غذا ہضم نہیں کر پاتا تو اسے نہیں کھانا چاہیے، (۳) جب تک پہلی غذا ہضم نہ ہو جائے دوسری غذا نہ کھانا چاہیے (۴) اگر پیٹ میں درد ہو تو اس کا سبب معلوم کر کے مناسب تدبیر کرنی چاہیے، (۵) پاخانہ اور پیشاب کا رکنا نہایت خطرناک ہے، کسی ایسی چیز کا استعمال نہ کرنا چاہیے جس سے پاخانہ یا پیشاب کے رکنے کا اندیشہ ہو (۶) آخری بات یہ ہے کہ جنگل میں تنہا نہ جانا چاہیے۔

حکیم میسری متعدد امراض میں طاعون کا خاص طور پر ذکر کرتا ہے، اس کا مشورہ ہے کہ جہاں طاعون پھیلا ہو اسے چھوڑ دینا مفید ہے۔ نیز جس کو طاعون ہو گیا ہے اس کے پاس بیٹھنے اور سونے سے پرہیز کرنا چاہیے، حکیم میسری آگے کہتا ہے کہ کمزور شخص کو دوا مفید نہیں ہوتی، سخت گرمی اور سخت سردی میں بھی دوا زیادہ اثر نہیں دکھاتی، موسم بہار اور خزاں میں دوا سودمند ہوتی ہے، انہی دنوں میں رگ کھلوانا مناسب ہے، بچوں کی رگ نہیں کھلوانی چاہیے، بچوں کو زیادہ دودھ مضر ثابت ہوتا ہے، اس سے مثانے میں پتھری پڑ جاتی ہے، آگے بیماری اور علاج کے سلسلے کی اور نصیحتیں ہیں اس کے بعد اصل موضوع شروع ہو جاتا ہے، پہلا عنوان فی داء الثعلب، دوسرا صفت حب یارہ، تیسرا فی النخالۃ، چوتھا فی الصداع ہے،

ہر ایک عنوان کے تحت چند اشعار ہیں۔ نہایت اختصار ملحوظ رکھا گیا جس کا اظہار کئی جگہ ہوا ہے:

بگفتم اندریں ترکیب عالم　　ونیز از حال فرزندان آدم
ہر آنچ او گفتنی بد مختصر را　　گزیدہ شد پسندیدہ اثر را (ص ۲۵)

گر اشترخا بود در مجری بول　　دریں بسیار باشد لفظ با قول
ولیکن ما بگفتیم کوتاہ　　کہ برگ و ساز باشد خود بر دراہ (ص ۱۳۴)

نشان دق دارم سخت بسیار　　گرش جملہ بگویم ہست دشوار
ولیکن خوار مایہ چیزکی زود　　بگویم خود بباشی زود خشنود (ص ۲۴۴)

ازیں ہر نام را شرحست بسیار　　ولیکن جائے من نہ جائے گفتار
اگر وصفش کنم بسیار گردد　　بچشم مرداں دشخوار گردد (ص ۲۹۲)

گرش یکسر ہمہ نسخت گرفتی　　گراں گشتی گرش جملہ بگفتی
بریں گفتہ مگر خود اختصار است　　وراں ناگفتہ خود اندک بکار است (ص ۲۰)

ناگہانی بیماریوں پر ایک مختصر سا باب ہے، اس میں کہتا ہے کہ اختلاج رگ سے لقوہ، اختلاج دوسرے عضو سے تشنج، خدر سے فالج، خواب میں سینہ کی سنگینی سے مرگی، چہرے اور پلک کا ورم استسقاء پر دلالت کرتا ہے، ہمیشہ منھ کی تلخی درد قولنج پر منتج ہوتی ہے، بہق سے جذام ہوتا ہے (وغیرہ ص ۲۱-۲۲)

چار عنصر یعنی صفرا، سودا، بلغم اور خون کے غلبہ پر ایک باب ہے، پہلے ہر ایک کے غلبے کے نتیجے میں جو مضر اثرات جسم انسانی میں مترتب ہوتے ہیں ان کا ذکر ہے اس کے بعد بچپن سے بڑھاپے تک جو جو خلط غالب ہوتے ہیں ان کا بیان ہے

یسری حکیم لکھتا ہے کہ بچپن سے انیس ۱۹ سال تک خون کے غلبے کا زمانہ ہے، اس کے بعد بیس ۲۰ سال صفرا کا غلبہ رہتا ہے، جب عمر پنتیس ۳۵ سال سے زیادہ ہوتی ہے تو سودا کا غلبہ ہو جاتا ہے، یہ غلبہ ساٹھ سال کی عمر تک باقی رہتا ہے، اس کے بعد پیری کا دور ہے، اس میں بلغم کا غلبہ ہوتا ہے، حکیم مذکور نے پھر انسانی عمر کے ساٹھ سال کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، پہلے انیس سال کودکی کا زمانہ ہے جو حرکت اور جنبش کا دور ہے، دوسرے انیس سال کا دور جذبات اور شہوات کا زمانہ ہے، ۴۵ سال کے بعد جوانی کی خواہشات جاتی رہتی ہیں، اور یہ دور ۶۰ سال تک قائم رہتا ہے، اس کے بعد آدمی ہر طرح کے امراض کا شکار ہوتا ہے، اس سلسلے کے چند اشعار سنیے:

زحد کودکی تا نوزده سال   همه سلطان خون باشد بهر حال
پس آنگه بیست سال دیگر آید   حد سلطان صفراش اندر آید
چو عمر از سی و پنجش بر گذارد   ز سودا بر طبیعت لشکر آید
ز سی و پنج تا شصت تماما   ز سودا بین همه سلطان کاما
پس آنگه حال زی پیری گراید   حد سلطان بلغمش اندر آید
بماند پیری و سلطان بلغم   بهم تا روزگار مرگ و ماتم
و طبع جنبش اندر جسم مردم   نیاید اندر بود بر سان کژدم
بوقت کودکی در پای باشد   نه بینی پای اندر وای باشد
نه پای کودک از حرکت بماند   و گر پایش بماند خود نداند
برین کردار باشد نوزده سال   پس آنگه جای دیگر گردش حال

که حرکت از دو پایش بر تر آید   جوان مرد از پی شهوت گراید
بماند نوزده سال او برین حال   و حال آرد دگر از گردش سال
برین حال او بماند نوزده تیز   نیندیشد بجز تمییز خود چیز
چو بر پنجاه و چل بر سو گذشت او   ز دیوان جوانی بر نوشت او
از آن حرکت که وی اندر دلش بود   از آن هر بیشتر زان چشم بر بود
برین سان باشد او تا شصت بر سو   پس آنگه آید از هر جای آهو
از آن حرکت بهر جا چیز کی خرد   بماند و آن دگر پیری فرد برد ص ۲۵

اس کے بعد کے عنوان میں مخصوص دواؤں کے نام حروف تہجی کے اعتبار سے نظم کر دیے ہیں، یہ عنوان اس طرح شروع ہوتا ہے:

که طبع مردمان دانسته آمد   ز نادانه بر تو بسته آمد
چنان واجب که داروها بدانی   ز نام و طبعها شان در نمانی
پس آنگه داروهای گونه گونه   بگویم جمله کان چون و چگونه
خدای ماکه مارا درد داد است   به هر دردیش صد دارو نهاد است
بگویم آن که ز و چاره نیابم   و بگذارم کز و یاره نیابم
هر آن دارو که معروفست بیشک   همه بنگارمش پیش تو یک یک
بدان نام طبیبانش بخوانم   نگر دانمش جز کوته زبانم
نه بیم آنک کانگه خام گردد   بنزد عاقلان بی نام گردد
گرت رغبت بود خود راه جوئی   بعلم آموختن بسیار پوئی
نگه کن تا چه گویم یاد دارش   بگوششش بشنو و بر دل نگارش

یہ مسری حکیم لکھتا ہے کہ بچپن سے انیس ۱۹ سال تک خون کے غلبے کا زمانہ ہے، اس کے بعد بیس ۲۰ سال صفرا کا غلبہ رہتا ہے، جب عمر پینتیس ۳۵ سال سے زیادہ ہوتی ہے تو سودا کا غلبہ ہو جاتا ہے، یہ غلبہ ساٹھ سال کی عمر تک باقی رہتا ہے، اس کے بعد پیری کا دور ہے، اس میں بلغم کا غلبہ ہوتا ہے، حکیم مذکور نے پھر انسانی عمر کے ساٹھ سال کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، پہلے انیس سال کودکی کا زمانہ ہے جو حرکت اور جنبش کا دور ہے، دوسرے انیس سال کا دور جذبات اور شہوات کا زمانہ ہے، ۴۵ سال کے بعد جوانی کی خواہشات جاتی رہتی ہیں، اور یہ دور ۶۰ سال تک قائم رہتا ہے، اس کے بعد آدمی ہر طرح کے امراض کا شکار ہوتا ہے، اس سلسلے کے چند اشعار سنیے:

زحد کودکی تا نوزدہ سال
ہمہ سلطان خون باشد بہر حال

پس آنگہ بیست سال دیگر آید
ہمہ سلطان صفراش اندر آید

چو عمر از سی و پنجش بر گذارد
ز سودا بر طبیعت لشکر آید

ز سی و پنج تا شصت تماما
ز سودا بین ہمہ سلطان کاما

پس آنگہ حال زی پیری گراید
ہمہ سلطان بلغمش اندر آید

بماند پیری و سلطان بلغم
بہم تا روزگار مرگ و ماتم

و طبع جنبش اندر جسم مردم
نیاید اندر بود بر سان کژدم

بوقت کودکی در پائے باشد
نہ بینی پای اندر وای باشد

نہ پائے کودک از حرکت بماند
وگر پایش بماند خود نداند

برین گردار باشد نوزدہ سال
پس آنگہ جای دیگر گردش حال

کہ حرکت از دو پایش بر تر آید
جوان مرد از پی شہوت گراید

بماند نوزدہ سال او برین حال
و حال آرد دگر از گردش سال

برین حال او بماند نوزدہ تیز
بیندیشد بجز تمییز خود چیز

چو بر پنجاہ و چل بر سو گذشت او
و دیوان جوانی بر نوشت او

از ان حرکت کہ زے او روش بود
از ان مر بیشتر زان چشم بر بود

برین سان باشد او تا شصت بر سو
پس آنگہ آید از ہر جای آہو

ازان حرکت بہر جا چیز کی خرد
بماند و آن دگر پیری فرو برد ص ۲۵

اس کے بعد کے عنوان میں مخصوص دواؤں کے نام حروف تہجی کے اعتبار سے نظم کر دیے ہیں، یہ عنوان اس طرح شروع ہوتا ہے:

کہ طبع مردماں دانستہ آمد
ز نادانہ بر تو بستہ آمد

چناں واجب کہ داروہا بدانی
ز نام و طبعہا شان در نمانی

پس آنگہ داروہائے گونہ گونہ
بگویم جملہ کان چون و چگونہ

خدائے ما کہ ما را درد داد است
بہر دردیش صد دارو نہاد است

بگویم آن کہ ز و چارہ نیابم
و بگذارم کز و یارہ نیابم

ہر آن دارو کہ معروفست بیشک
ہمہ ہنگارمش پیشت تو یک یک

بدان نام طبیبانش بخوانم
نگر دانمش جز کوتہ برانم

نہ بیم آنک کانگہ خام گردد
بنزد عاقلاں بی نام گردد

گرت رغبت بود خود راہ جوئی
بعلم آموختن بسیار پوئی

نگہ کن تا چہ گویم یاد دارش
بگوشش بشنو و بر دل نگارش

انیسون و افتیمن و اسارون   اقاقیا و اسقیل و اتیمون

اشق و انجرہ، اثمد و ابہل   و اُشنہ، انزروت و اصل سنبل

ابر بارس الطمطومہ و ابرسا   و اکلیل الملک یس بقل حمقا

و بلسان و برنگ و بنج و بورہ   و بزر آسیا و شان و بان و زیرہ

و بوزیدان و بادآورد و بہمن   و پنج انگشت انوخر ریم آہن

بنفش و بسد و بادنہ و مُر   و بسباسہ و بلبوس و بلادُر

جبل ہنگ و جلاب و جوز بویا   و جند بیستر و جور و قلمیا الخ

و جوز ماثل و جبیر و جلنار   و جاوشیر و جوز قی و درمجار

و جرجیر و جگرما جنطیانا   جرمش و جعدہ و برز قطونا

درونہ و دلب و ردی و ہیلہ   و دفلی دیو دار و پس بلیلہ

دہل دہور و دوح دوس و دمہ   زراوند و رازد سنگ سرمہ

زجاج و زنجبیل و زر زرنب   و زعفادرہ و زرنیخ اشہب

زرنباد و زک و زنبق و زیرہ   و زفت و زعفران و قیل و زہرہ

حسک و حب نیل و شحم حنظل   حماما و حقنص حاشا و جرفل

حنا و حرمت دار و حی عالم   طباسیر و جلال و طلخ علقم

ومیبروح و کما فیطس و کندش   کیسلا، کہربا، کیہ و اہلپوش

کمفت دریا و گوگرد و کبابہ   کسناج گیل دار و گل و جلبہ الخ

اس کے بعد کا عنوان طبایع الادویہ جو بہت طویل باب ہے، وہ اس طرح پر شروع ہوتا ہے:

... ...

کنون لختی ز طبعش می بگوییم   وزین نامہ گرانی می نجوییم

اسارون گرم و خشک ست و جگر را   قوی دارد و عروق درد گذر را

و اذخر گرم و خشک ست و بیک راہ   برون آرد ز معدہ درد و آماہ

و ابہل گرم و خشک و فعلش آنست   کہ حیض آرد زنان را بی گمانست

و افتیمون ہمہ گرمست و سودا   بیارد از تن و کیموس گندا

و گرمست انجدہ بفزاید او باہ   ببرد بلغم و خنازی کند راہ

ز افتیمن نہ بینم جز کہ گرمی   و خشکی نیز با او نیست نرمی

از و معدہ بسی قوت ستاند   و مالیخولیا جملہ براند

انیسون گرم باشد شہوت آرد   تمتع را بہ بی شک قوت آرد الخ

میسری حکیم نے حسب ذیل زہروں کے نام اور ان کے علاج درج کیے ہیں:

زہر بیش، زہرۂ پلنگ۔ زہر افعی، خوہ اسپ۔ زراریح، زنگ، زنگار، صابون، فربیون، افیون، یبروح، گوز ماثل، بنج، آب ترکشنیز، اسفیوش کوفتہ، سمار وغ، شیر بستہ، بریان منغموم، ماہی سرد، شیر ناخوش، مغز اروغ شدہ، زیک خوردہ، خرگوش بحری، جند بیدستر، بلادُر، خرزہرہ، عنصل، انجرہ، رخام، مردار سنگ، سیماب، شنگرف، اسفیداج، آہک، زرنیخ و صابون، ریم آہن، عرطنیثا و کندس و جبل آہنگ، وندو فربیون، مازریون، سقمونیا و شبرم و یتوع۔

غرض حکیم میسری کی یہ کتاب طبی نقطۂ نگاہ سے اہم تصنیف ہے، اس میں چوتھی صدی ہجری کے ایک طبیب کے اہم تجربات کا نچوڑ ہے، اس میں سیکڑوں مفردات کا

ذکر ہے، جن سے دورِ حاضر کا طبیب ناواقف ہے، ان مفردات کی تلاش اور ان کی جانچ طبی تحقیق میں کارآمد ہو سکتی ہے، یہ کتاب صدہا ایسے امور کی حامل ہے جو اب تک کسی طبیب کے تجربے میں نہیں آئے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کے تجربے سے اہلِ علم فائدہ اٹھائیں، اس میں ہزارہا نسخے ایسے ہیں جن پر جدید دور میں آزمایش کی جا سکتی ہے، اور اس سے مفید نتائج نکل سکتے ہیں۔

اس کتاب کی پہنائی اور مصنف کے وسعتِ معلومات کا کسی قدر اندازہ ادویہ و اغذیہ و اشربہ کی اس فہرست سے ہو سکتا ہے جو مطبوعہ کتاب کے تیس صفحے کو حاوی ہے۔

دانشنامہ کا صرف ایک ہی نسخہ پیرس کے کتاب خانۂ ملی میں زیر شمارہ R_7799 _ 3/5 موجود ہے، اس میں ۱۶۴ ورق ہیں، اور اس کا سائز ۱۸ × ۱۳ سینٹی میٹر ہے[۱]، کاتب محمود تبریزی شاہ نامہ خوان ہے، جس نے سوم ربیع الاول ۸۵۲ھ میں یہ نسخہ مکمل کیا اور غلطی سے اس کا نام کتاب منصوری لکھا، بعد میں دوسرے قلم سے کتاب المنصوری بالطب للرازی لکھا ہے، اس کتاب میں بعض جگہ دوسرے کاتب کا خط بھی ملتا ہے، اس جدید اضافے میں غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں، کتاب کے اوراق بعض جگہ غیر مرتب ہیں، کچھ اوراق درمیان سے غائب ہیں، اس کتاب پر ایک عالمانہ و محققانہ مقالہ ڈاکٹر جلال متینی استاد دانش گاہ مشہد نے مجلۂ دانش کدہ ادبیات و علوم انسانی مشہد شمارہ سوم سال ہشتم میں شایع کیا تھا، یہ کتاب تہران میں ۱۳۶۶ شمسی میں ڈاکٹر برات زنجانی کی توجہ سے زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہے، یہ کوشش انتقادِ متن کا نہایت قابلِ توجہ نمونہ ہے، اور ان کا محققانہ مقدمہ مصنف کی زندگی اور کتاب کے مختصات کے بارے میں اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

دانشنامۂ میسری کی اہمیت کا کسی قدر اندازہ تفصیلات بالا سے ہو چکا ہو گا، اس

[۱] کل اشعار ۱۰۴۴۸ ہیں۔

کتاب کی اہمیت چند اور وجوہ کی بنا پر بھی ہے، ان میں بعض یہ ہیں:

(۱) چوتھی صدی ہجری کا بہت قلیل فارسی ادب محفوظ رہ گیا ہے، اس میں دانشنامۂ میسری کی وجہ سے کافی اضافہ ہوا ہے۔

(۲) شاید اتنا بڑا شعری مجموعہ اتنا قدیم کوئی نہ ہو، اور واضح ہے کہ اتنی بڑی مثنوی تو کوئی بھی باقی نہیں، پھر اس کی بحر بھی قابلِ توجہ ہے، یعنی بحر ہزج مسدس محذوف (مفاعیلن مفاعیلن فعولن دوبار) شمس قیس رازی نے اس کو بہت پسندیدہ وزن بتایا ہے۔

(۳) فارسی طبی ادب کی سب سے قدیم کتاب ہے، اور طب منظوم کے اعتبار سے تو اس کی اہمیت اور ندرت مسلم ہے۔

(۴) زبان و بیان سادہ اور رواں ہے، اس بنا پر دورۂ سامانی کی شاعری کا نہایت قابلِ توجہ نمونہ ہے۔

(۵) اس کتاب کی لسانی اہمیت مسلمہ ہے، یہ دانشنامہ چوتھی صدی ہجری کی زبان کے مطالعے کا اہم ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے، یہ مطالعہ دو سطح پر کیا جا سکتا ہے (۱) اس میں عربی زبان کا اثر کم ملتا ہے، فارسی کے سیکڑوں ایسے الفاظ، ترکیبات، مصادر ملتے ہیں جو اب متداول نہیں، اس سے اس دور کی زبان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے (۲) دستورِ زبان کے اعتبار سے اس کا مطالعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، اس کی مدد سے پرانے متون کے سمجھنے اور ان کی زبان کے تحقیقی مطالعے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔

ذیل میں اس کی لسانی خصوصیات کے سلسلے کی کچھ تفصیلات پیش کی جاتی ہیں

(۱) بعض کلمات مشدد صورت میں ملتے ہیں، جیسے نمکّت، چلّ، بدّری، جزّ

عمرؓ : نمک سودہ در دندانش مالد ۱۴۲۰

در دبستہ ددیت وچل وششش لخت ۱۴۴

کسی کز پڑی صفرای بسیار ۴۱۸۳

وپڑساوشان گرم است وبلغم ۴۳۶

سیہ چشمان نباشند جز بدون ۲۵۲

ابر بوبکر وعمرؓ نیز عثمان ۴۴۶۶

(۲) واو عطف اشعار ومصرع کے شروع میں بے ضرورت لائے گئے ہیں

و طبع صبر گرم و بل کہ صفرا

وسرد وخشک باشد صمغ داشکم

وگرم ونیک باشد قرد مانا

وصابون گرم باشد تن کند ریش

وعصفر بر کند از تن کلف را ص ۳۵۔

(۳) غیر جاندار میں "ہا" کے بجائے "ان" کے اضافے سے جمع بنانے کا رجحان

غمان ، اندوہان ، ماہیان ، شاہیان ، ناخنان ، رخان ، کژدمان ، ماران

خرگگان ، چشمکان ، انگشتکان وغیرہ۔

(۴) گر ، ار بمعنی یا کا استعمال

وگر ضیق نفس باشد کسے را ز بلغم گر زخون وگر زصفرا ۹-۱۶

(۵) او، اور وی کا استعمال غیر جاندار کے لیے۔

(۶) استعمال بہ ، در ، درون ، اندر بعد از مجرور مانند :

بیامیز وطلا کن بر شکم بر ۲۶

ازاں روغن بتن در گو ہمی مال

ز چشم اندر سپیدی او زداید

وگر بشکم درون کرم دراز ست

(۷) استعمال کلمۂ ابا ، ابی ، ابر بجائے با ، بی ، بر

(۸) تکرار الفاظ برائے تاکید معنی جیسے خشک خشک ، بسیار بسیار ، گرم گرم ، نیک نیک ، سرد سرد ، زود زود ، نرم نرم وغیرہ۔

(۹) عربی جمعوں میں 'ہا' کے اضافے سے جمع الجمع بنانا ، جیسے آلاتہا ، مفاصل ہا کتبہا۔

(۱۰) بعض اسماء وغیرہ میں حرف الف کا اضافہ جیسے اسپید ، اشکم ، اشنوائی ، اشتر اسیاوشان ، اشمردن وغیرہ۔

(۱۱) بائے زینت کا استعمال افعال نہی میں جیسے بمنشیں ، بمزدای وغیرہ۔

(۱۲) ہمی کا استعمال کئی طرح سے جیسے :

امر کے پہلے : ہمی خور ، ہمی ریز ، می بیاشام۔

زاید جیسے : خودم می آں بگویم گر بنوشی۔

فعل سے جدا جیسے : بسیری گر کسے می رگ گشاید۔

وگر کس را بنوبت می تب آید۔

(۱۳) اضافت اور صفت مقلوب کی متعدد مثالیں ملتی ہیں جیسے گل روغن (روغن گل) روشن می (می روشن) ، می صاف ، چشم گوشہ (گوشہ چشم)۔

(۴۴) اس کتاب میں سیکڑوں لغات و ترکیبات ہیں جن سے اس کی قدامت ظاہر ہوتی ہے۔ ان میں سے چند یہ ہیں :

بخشایا = بخشندہ ، زی = طرف ، پہنائی = عرض ، یالائی = طول ، کام و ناکام = خواہ ناخواہ ، اندروای = معلق ، باداخراہ (مکافات بدی)، نعت (وصف) ہمارا = ہموارہ ، مغز (مادہ) ، دری (فارسی) ، زفان (زبان) ، بیران (ویران) زادمرد (آزادمرد)، در (باب) ، برزش (مواظبت) ، گو (زیرک) ، بداد (عاقل) ، گش زرد (صفرا) گش سیاہ (   ) مبرزہ (مستراح) ، چابوک (چالاک) ، گرم گوہر (گرم مزاج) یقینی (قطعی) ، انتشار (پراگندہ شدن)، تارگونہ (تیرہ رنگ)، مذہب (روش)، شیریانہ (شریان)، خوہ (خوی)، غم دار (غمگین) ، کاہل (تنبل) ، قلیل الفہم (کم خرد)، گوہر (مزاج) بسندہ (کافی)، تن آسان (آسودہ) ، تمتع (برخورداری، تربیت) ، ازیں یابت ، کابوس بی کامی (بدون خواہش) تماما (تمام) ، زاد (سن) ، برسو (بالا)، آہو (عیب) یارہ (بخش) گرانی (دشواری) ، آماہ (آماس) ، کہن تب ، ناپاک (بغیر ڈر) باداشکن (بادشکنندہ) جگرگون (رنگ سیاہ بسرخی مائل) ، توش (تپش) ، تخلفہ (ہیضہ) ، طلی (اندود) دیدار باریک (ضعفِ بینائی) ، بستم (بزور) ، وشم (ناگوار) ، اندرخور (سزاوار) بادزشت ، بادوزم ، طب نامہ (کتاب طبی) احتما (پرہیز) ویحک (افسوس) ، ابی (بدون) ، واداشتن (بازداشتن) ، برازت (برتری) بی کام (ناچار) خوردنگ (مقدار کم) ، گرمادہ (گرمابہ) ، سلیم (سالم) ہیچیز (ہیچ چیز) نااستاد (استاد کی ضد) ، بازو (باد) ، ہنک (سرکہ) ، طلخ گاؤ (گائے کا پتہ) ، بانور (نورانی) زیرباآش (زیرہ) ، ابرجای (برجای) ، خایہ (تخم مرغ) ابازو (باد) ، گل روغن (روغن گل) ، بستم (بزور) ، عجین (خمیر) ، خوار مایہ (اندک) ، خوار (آسان) ، فرگان (فرگان)

سختہ (وزن کیا ہوا) ، برریق (بھوکے) ، شش یک (چھٹا) ، یکی گاہہ (کسی جگہ) ، شبگیر (سحرگاہ) ، کیہن (کہین) ، تیس (ہزنر) بادریس (چرخے کی تکلی) روشن می (۸۰) چشم گوشہ (۷۴) ، افتیدہ (افتادہ) ، پلیتی (فلیتی) (فتیلہ) فلیت ، فلیتہ (فتیلہ) طیارہ (جہندہ) ، آدار (آذار) ، انگوین (انگبین) ، گوارش (جوارش) ارجو (امیدوار ہوں) ، ہندون (ہندی) ، قافیہ ہے :

قوا انجیر آرہ زردہ تمر ہندون   زہر یک دو درم بایدش موزون (۹۹)

تیو (تھوک) نیم از دہ یکی (۱/۲۰) ، گوشت آبہ (آب گوشت) ، سکی (سیک) (ایک سوم) نیم دہ یک (۱/۲۰) شکم ماش (شکمش را) ، گذارش (ہضم) ، کالم (بیوہ) ، چیک (ایک قطرہ) شرم (آلت تناسل) ، دژنام (زشت نام) ، اباب (بابت) ، آماہیدہ (آماسیدہ) ایچ (ہیچ) فلیت (فلیتہ) ، اندرام (جمع ورم) ، بو (آرزو) ، انفحہ (پنیرمایہ) ، بسندہ (کافی) ، لخشکی (لختی) ، بارگی دو (دوبارہ) ، خوی (عرق) ، بارگی (اندکی) ، بررجت (بتدریج) علی الحال (فوراً) ، سگ سگاں ، کلب الکلب (سگ دیوانہ) ، تشنی (تشنگی) ، زفان (زبان) ، بی دست (ناتوان) گشتہ (گذشتہ) ، نکار (از کار افتادہ) ، ناپاک (حرام) ، اوکن (افگن) ، برسو (بالاتر) ، سی وچل برسو (بیشتر از سہ و چہل) ، نوی (حدوث) ، نو (حادث) ، باستم ، بستم (بزور) ، خستہ ، مجروح ، نیرو (قوی) وغیرہ ، کالم (بیوہ) ، اندرور (سزاوار) ، طلخ (زہرہ) ، ازگہ (در موقع) ، یادافراہ ...

دانش نامہ کے لغات و ترکیبات پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب فارسی الفاظ کے ارتقائی منازل کے سمجھنے میں بڑی مفید ہو سکتی ہے ، اور اسی لحاظ سے علم "لسانیات" میں اس کی خاصی اہمیت ہے ، فارسی الفاظ کے ارتقاء کے سمجھنے کے سلسلے میں حسب ذیل

امور سامنے آتے ہیں :

(۱) ایسے الفاظ ہیں جن میں 'ب' کی جگہ 'واؤ' ملتا ہے، مثلاً گرماوہ (گرمابہ)، انگوین (انگبین)، توش (تبش یا تپش)۔

(۲) ایسے الفاظ ملتے ہیں جن میں 'ب' کے بجائے 'ف' ملتے ہیں، جیسے زبان کے بجائے زفان، آبلہ کے بجائے آفلہ۔

(۳) ایسے الفاظ ہیں جن میں 'س' کے بجائے 'ہ' ہے، جیسے آماس کے بجائے آماہ، آماسیدن کے بجائے آماہیدن۔

(۴) ایسے الفاظ ہیں جن میں 'واؤ' کے بجائے 'ب' ہے، جیسے ویران کے بجائے بیران۔

(۵) قلب کی مثالیں مل جاتی ہیں، جیسے فلیتہ بجائے فتیلہ، کیہن بجائے کہین

(۶) ہائے مختفی کے اضافہ سے الفاظ بدلے ہوئے ملتے ہیں، جیسے نادان سے نادانہ، شیریان سے شیریانہ۔

(۷) بڑی تعداد میں ایسے الفاظ ملتے ہیں جن کے شروع میں الف زائدہ ملتا ہے جیسے ابا = با، اباوہ = باوہ، اباوی = باوی، ابر = بر، ابرتو = برتو، ابرجای = برجا، ابرکردار = برکردار، ابی = بی، اباز = (باو)۔

(۸) جہاں تہاں حذف 'ہ' کی مثالیں ملتی ہیں، جیسے ایچ کے بجائے ہیچ۔

(۹) بعض الفاظ میں 'ت' کی جگہ واؤ، جیسے انگن کے بجائے ادگن۔

(۱۰) بعض پیشوند سے نئے لفظ بنائے گئے ہیں جیسے بی کام = ناچار، ناکام = ناچار، نااستاد (استاد کی ضد)، نکار (از کار افتادہ)، بنیرو (طاقتور)، باستم بستم (بزدل)

باخطر (ارزش مند)، بدندان (قوت والا)، بداد (عادل)۔

ایک قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس میں بعض الفاظ ایسے مل جاتے ہیں جن کا چلن عام نہیں بخلاف اس کے اردو میں ان کا استعمال عام ہے، جیسے کاہل، بلیتہ، گل روغن بی دست [وپا]، خستہ (پریشان)، انتشار (پراگندگی) وغیرہ، دراصل بات یہ ہے کہ اردو میں فارسی کے صدہا لفظ ایسے موجود ہیں جن کے املا، معنی اور تلفظ میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ملتی، جب کہ فارسی میں ان کی صورتیں بدل گئی ہیں، تلفظ کے سلسلے کی بہترین مثال واو مجہول اور یائے مجہول کی آوازیں ہیں، جو ایرانی تلفظ میں نہیں آتیں اور چونکہ یہ آوازیں املا میں ضبط نہیں ہوسکتیں، اس لیے اہل ایران کے لیے ایسے الفاظ کا تلفظ دشوار بلکہ ناممکن ہوگیا ہے، جن میں قدیم متون میں واو مجہول یا یائے مجہول تھے اس لیے کہ معلوم ہے کہ قدیم زمانۂ ایران کے تلفظ میں یہ آوازیں تھیں، اور ان کا تعین کر سکنا جہل کی علامت سمجھی جاتی تھی، مثلاً شیر (حیوان درندہ) اور شیر (دودھ) دونوں کا املا ایک سا ہے، لیکن قدیم میں پہلے کا تلفظ یائے مجہول سے اور دوسرے کا یائے معروف سے تھا جب کہ دونوں کا املا ایک ہی سا ہے ہمارے ملک میں یہ تلفظ باقی ہے اور تلفظ کا یہ تسلسل شفاہی روایت پر مبنی ہے جبکہ ایران میں یہ روایت ختم ہوچکی ہے ایک اور مثال سے اس کی وضاحت ہوسکے گی : زور (طاقت)، زور (بمعنی تزویر) کا املا اور تلفظ جدید ایران میں ایک سا ہے، لیکن قدیم میں پہلے میں واؤ مجہول اور دوسرے میں واؤ معروف تھی، اور یہی صورت ہندوستان میں برقرار ہے، غرض ہندوستان میں فارسی الفاظ کا تلفظ تاریخی اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے، الفاظ کے معنی میں جو تبدیلی ہوئی ہے وہ کم اہم نہیں اور معنی کی اسی تبدیلی کی وجہ سے اہل ایران کے لیے

خود اپنے قدیم متون کا سمجھنا مشکل ہوگیا۔ لفظ انتشار کو لیجیے تو دانشنامۂ میسری میں بمعنی دگرگونی آیا ہے، اردو میں یہ لفظ عموماً اسی معنی میں مستعمل ہے، البتہ جدید ایران میں یہ لفظ محض اشاعت کے لیے آتا ہے، مجھے ایک واقعہ نہیں بھولتا، پروفیسر عابدی صاحب استاد دانشگاہ دہلی ایران میں تھے، انھوں نے اپنے مقالہ میں ایک جگہ کچھ ایسا لکھا تھا کہ ستر ہویں صدی میں دلی میں بڑا انتشار تھا، ان کے استاد رہنما پروفیسر خطیبی تھے، انھوں نے کہا کہ ممکن نہیں کہ دلی میں اتنا انتشار ہوا ہے، وہ انتشار کے معنی اشاعتِ کتب اور عابدی صاحب ہندوستانی معنی میں اس لفظ کا استعمال کر رہے تھے، حقیقت امر یہ ہے کہ قدیم فارسی میں انتشار بمعنی دگرگونی موجود تھا، اور ایران ہی سے اردو میں یہ لفظ آیا اور اس زبان کے ذریعہ اس کے قدیم معنی محفوظ ہیں۔

خلاصہ یہ کہ دانشنامہ لسانی اعتبار سے اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

استدراک

حال ہی میں یادداشتہائے قزوینی مرتبہ ایرج افشار ج ۷ نظر سے گذری، اس میں حکیم میسری کے ممدوح مخدوم کے بارے میں میرزا محمد قزوینی کی رائے تقریباً وہی ہے جو راقم الحروف اور بعض دوسرے ناقدین کی ہے، ان کے خیال میں ممدوحِ میسری نہ ناصرالدین سبکتگین اور نہ ناصرالدین بدر بن حسنویہ حاکم کردستان ہے بلکہ احتمالاً ابوالحسن سیمجور ہوگا، موصوف کا بیان یہاں نقل کرتا ہوں:

"ناصرالدولہ: ایں لقب را برائے حسنویہ نہ در تجارب الامم نہ در ابن الاثیر نہ در تاریخ منجم باشی نہ در جہاں آرا یافتم نہ در لین پول دلی برائے پسرش بدر کہ در سنہ ۳۸۸ از بغداد ایں لقب را فرستادند ہم در ابن الاثیر وہم در تجارب الامم وہم در جہان آرا وہم در لین پول ۱۳۰ یافتم، پس دعوی بلوشہ ۲: ۸۲ کہ ناصرالدولہ را ہم لقب حسنویہ پنداشتہ وہم لقب پسرش بدر گویا بکلی وبکلی بی ماخذ باشد۔

لقب ابن بقیہ وزیر بختیار (دائرۃ المعارف اسلام، ترجمۂ عربی ۲: ۱۰۱)

"واندریں وقت سبکتگین را ناصرالدولہ لقب دادند ومحمود را سیف الدولہ"

A.F.P.62 252a مجمل التواریخ

یکی لقب سبکتگین (رجوع بورقۂ دیگر بہمیں عنوان، ودیگر لقب محمد بن ابراہیم بن سیمجور متوفی در سنہ ۳۷۸ - انساب "سیمجور" وآثار الباقیہ ۱۳۴)

ودیگر لقب بدر بن حسنویہ کرد کہ در سال ۳۸۸ ایں لقب را از بغداد بدو دادند (ابن الاثیر در حوادث ہمیں سال)

مخدوم احتمالی کتاب دانش نامہ کہ منظومۂ طبی ست (بلوشہ ۲: ۸۲ - ۸۳) گویا ابوالحسن سیمجور باشد اگر اسلوب شعری مانع ازیں مسئلہ نباشد۔

دانش نامہ کا ایک ہی نسخہ موجود ہے جو کتاب خانۂ ملی پیرس میں ہے، اسی نسخہ کو بلوشہ نے کتاب خانہ کی فہرست ج ۲ ص ۸۲ - ۸۳ میں متعارف کرایا ہے، اور اسی فہرست میں امیر کرد نژاد حسنویہ بن حسین کے متعلق لکھا ہے کہ سنہ ۳۵۰ھ میں اس کو بویہی بادشاہ عضدالدولہ کی طرف سے حکومت کردستان اور عباسی خلیفۂ بغداد کی طرف سے ناصرالدولہ لقب ملا تھا۔

مشاعرہ قدیم ہندوستان اور عرب میں

از

جناب علی جواد زیدی صاحب۔ بمبئی

"بہت عرصہ کے بعد معارف کو جناب علی جواد زیدی صاحب کی قلمی جود وسخا سے متمتع ہونے کا موقع ملا ہے، ناظرین ان کی صحتیابی کے لیے دعا فرمائیں تاکہ یہ سلسلہ قائم رہے، ان کا مکتوب گرامی بھی اس اشاعت میں دیا جارہا ہے، یہ مضمون ان کی زیر طبع کتاب "تاریخ مشاعرہ" کا ایک باب ہے" (ض)

ہندوستانی اور پاکستانی مشاعرہ خاصے کی چیز ہے۔ اس طرح کا کوئی اور ادارہ کسی دوسرے ملک میں موجود نہیں ہے۔ دوسرے ملکوں سے جو لوگ آتے ہیں اور ہماری ان شعری مجلسوں میں شریک ہوتے ہیں، وہ صرف محظوظ ہی نہیں ہوتے بلکہ حیرت کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ اس طرح کا ادارہ کس طرح وجود میں آیا اور اس نے اتنی ہر دل عزیزی کس طرح حاصل کر لی؟ اگر ہم بھی ایسی صحبت سے یکایک دوچار ہوتے تو غالباً حیرت کے ایسے ہی جذبات ہمارے دل میں بھی ایک بار جاگ جاتے۔ ویسے تو مشاعرہ اردو شاعروں سے اور اسی لیے ہندوستان و پاکستان سے مخصوص رہا ہے لیکن آج جب کہ اردو بولنے والے ملکوں ملکوں پھیل چکے ہیں، ان کا یہ محبوب اجتماع بھی بین الاقوامی حیثیت اختیار کر گیا

ہے۔ زبانوں میں بھی اب یہ اردو ہی تک محدود نہیں رہ گیا ہے بلکہ ہندی میں کوی سمیلن اور پنجابی میں کوی دربار بن کر دائر و سائر ہو گیا ہے۔ ان حالات میں فطری طور سے ذہن اسکے تاریخی ارتقا کی داستان مرتب کرنے کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔

ابتدا: ہندوستان میں

یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ مشاعروں کی ابتدا کب اور کن حالات کے ماتحت ہوئی کیونکہ آج تک کسی زبان میں مشاعروں کی تاریخ مرتب نہیں کی گئی ہے لیکن بادی النظر میں ان مشاعروں کی تحریک شاعروں کے اس جذبے سے ہوئی ہوگی کہ دوسرے ان کی شاعری کو سنیں اور ان کی کوششوں کو سراہیں غالباً ایسی صحبتیں شروع شروع میں نجی رہی ہوں گی اور شعرا کے مکانوں پر ہی منعقد ہوتی رہی ہوں گی۔

ایسی صحبتوں کا ذکر سب سے پہلے ہمیں راج شیکھر (۹۲۰-۶۸۸۰) کی "کاویہ میمانسا" کے دسویں باب میں ملتا ہے۔ اس باب میں راج شیکھر شاعروں کے معمولات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ شاعر کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ لگاتار علوم و فنون کا مطالعہ کرتا رہے دل، زبان اور عمل کا پاک و صاف ہو اس کا مکان صاف ستھرا اور ہر موسم کے لحاظ سے باآسائش ہو۔ اس کے ملازم اپ بھرنش میں باتیں کریں اور گھر والے اور گھر والیاں سنسکرت اور پراکرت سے واقفیت رکھتے ہوں۔ اس کے دوست سبھی زبانوں سے واقف ہوں۔ لکھنے کا سامان، جیسے کھریا، قلم، دوات، بھوج پتر وغیرہ ہر وقت اس کے سامنے موجود رہے۔ شاعر، اپنی نامکمل کاوش دوسروں کو نہ سنائے۔ وہ اپنے نظام اوقات کو چار حصوں میں بانٹ دے۔ صبح کو پوجا پاٹ سے فارغ ہو کر مطالعہ کرے۔ مطالعے کا کمرہ الگ ہو جہاں وہ شعر و شاعری کے علاوہ دوسرے علوم سے فیض حاصل کر سکے۔ دوسرے پہر شعر نظم کرے۔ دوپہر کے لگ بھگ نہا دھو کر کھانا کھائے۔ غذا سے فارغ ہو کر شعری

نشست منعقد کرے، اپنے وقت کے چوتھے حصے میں اپنی تصنیف پر نظر ثانی کرے اور اچھی
طرح جانچے پرکھے اور شعری نشست میں ہونے والی تنقید و تعریف کو پیش نظر رکھ مناسب
ترمیم کرے۔

یہ ایسے ہی شاعر کا نظام اوقات ہو سکتا ہے جسے شعر و شاعری کے علاوہ دنیا کا
کوئی اور کام نہ ہو۔ اس سے یہ تو معلوم ہی ہوتا ہے کہ کم از کم راج شیکھر کے زمانے (نویں
صدی عیسوی) تک شاعری ایک مستقل پیشہ بن چکی تھی۔ راج شیکھر یقیناً پہلا شاعر نہیں
تھا جس نے اس طرح کے یا اس سے ملتے جلتے نظام اوقات کی پابندی کی ہوگی۔ درحقیقت
اس بیان میں واتسائین کی "کام سوتر" میں بیان کردہ شہریوں کے معمولات اور
"ارتھ شاستر" میں بیان کردہ راج پاٹ کے معمولات کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔

خود راج شیکھر نے اسی کتاب میں راجاؤں کے درباروں میں منعقد ہونے والی
مجلس شعرا کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کیا ہے۔ وہ راجاؤں کو یہ مشورہ دیتا ہے کہ وہ شاعروں
ناظموں اور دوسرے دانش وروں کا امتحان لینے کے لیے "برہمہ سبھا" کا انعقاد کیا کریں
اجینی کی ایسی ہی "برہمہ سبھاؤں" میں کالی داس، میشٹھ، بھارو، کے پائے کے شاعروں کا
امتحان لیا گیا تھا۔ پاٹلی پتر کی سبھاؤں میں اُپ ورش، ورش، پانِنی، پنگل، ویاڈی، وررچ،
پتن جل جیسے علما میدانِ امتحان میں سامنے آئے تھے۔ ان امتحانات سے اس زمانے کے
درباروں کے ماحول اور شاعروں کے بلند مقام کا اندازہ ہوتا ہے۔ شاعروں کو راج
سبھاؤں اور درباروں کی زینت سمجھا جاتا رہا ہے جیسا کہ سنسکرت شاعر کہتا ہے:

विद्वास: कवयो भट्ट: गायका: परीहासका:
इतिहास पुराणज्ञा: सभा सत्वाह संयुता:

"(دانشور، شاعر، بھاٹ، مغنی، وِدوشک، مورخ اور پُران کے جاننے والے سبھی
راج سبھا کے ضروری اجزا اور شوبھا ہیں)"

چنانچہ کالی داس، بھارو، وررچ، پتن جل، پانِنی کسی نہ کسی راج کے رکن تھے۔ ریاستوں کی
طرف سے مختلف علوم کی مناسب اور معقول سرپرستی ہوتی تھی۔ کبھی کبھی مختلف راج دھانیوں
کے شاعروں کے مابین زبردست باہمی رقابتیں بھی رونما ہو جاتی تھیں اور اس سے بھی
شاعروں کی نگارشات کو مہمیز ہوتی تھی۔

راج شیکھر کے تصور کا شاعر ایک ذی حیثیت اور متمول شاعر کے علاوہ کوئی اور
نہیں ہو سکتا۔ اس کے مکان کی ساخت میں آرام و راحت کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔
کمروں کی بناوٹ اس طرح کی ہے کہ ہر موسم میں آرام ملے۔ ایک سایہ دار باغ ہے، جھیلیں
ہیں، تالاب ہیں اور حوض ہیں، شہ نشین ہے، غسل خانہ ہے، ہنس اور چکور جیسے طیور ہیں،
سواری کے لیے پالکی ہے، کام کے لیے خادم ہیں۔ مطالعہ کا کمرہ الگ ہوگا اور کم سے کم
نشست گاہ تو الگ ہی ہوگی، جہاں وہ شعرا کی صحبت سے لطف اندوز اور فیضیاب ہوتا
ہوگا۔ خاصے امیرانہ اور بے فکری کے ٹھاٹھ باٹ ہیں۔ اگر ایسا شاعر خود امیر فرض نہ کیا
جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ "کاویہ میمانسا" کے ذریعے سے راج شیکھر مربی حکمراں سے ان
سہولتوں کا مطالبہ کر رہا ہے۔ بہرحال راج شیکھر (اپنی جہاں گردی کے باوجود) اور
بان ان شعرا میں ہیں جن کے مکان اور ماحول معیار پر پورے اترتے ہیں، لیکن یہ ماننا
دشوار نظر آرہا ہے کہ جس شاعر کو یہ ماحول میسر نہ ہو اور جس کے پاس آرام و راحت کے
یہ وسائل یکجا نہ ہو سکیں وہ شاعری کی دنیا میں یا تو قدم ہی نہیں رکھ سکتا یا اگر قدم
رکھے گا بھی تو اس کی قدر دانی نہ ہوگی۔ شاعری کوئی موروثی صلاحیت نہیں کہ جن کے

پاس کشادہ اور آرام دہ مکان ہوں وہیں جاگیرداری کی طرح شاعری بھی براجمان ہوا۔
یہ شبہہ اسی ایک بات سے دور ہو جانا چاہیے کہ سنسکرت شعرا کے لیے علوم و فنون سے واقفیت ضروری تھی اور علم کی دولت جاگیردارانہ دولت کے پہلے ہی حاصل کرنا پڑتی تھی۔ راج شیکھر سے پہلے بھی علمائے سنسکرت نے شاعروں کا عالم ہونا ضروری قرار دیا ہے اور یہ صورت حال عربی سے مختلف ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی کے عالم وامن نے "کاویا لنکار شوتر" میں شاعر کے لیے یہ لازمی قرار دیا ہے کہ وہ فن شعر کے علما کی خدمت میں رہے۔ اس کے پہلے چھٹی ساتویں صدی عیسوی میں بھامہ نے "کاویا لنکار" میں ایسے علما کی خدمت میں حاضری ضروری بتائی ہے جنھیں لغات پر عبور ہو۔ اور گیارہویں صدی عیسوی میں کشیمیندر نے "کوی کنٹھ بھرن" میں شاعر بننے کے خواہش مند افراد کو یہ ہدایت کی ہے کہ وہ ایسے گروہ کی خدمت میں حاضری دیں جو ادبیات کا عالم ہو۔ راج شیکھر نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ مطالعے کا عمل مسلسل جاری رہنا چاہیے۔

اس پس منظر میں ذرا اس دربار کو ذہن کی آنکھوں سے دیکھیے جس میں بیک وقت دانشور، شاعر، بھاٹ، مغنی، ودوشک، مورخ اور علمائے پران سب جمع ہیں۔ یہاں شاعر اگر ان علوم و فنون پر حاوی نہ ہو جن کی طرف راج شیکھر اور دوسرے علما نے اشارہ کیا ہے تو ان درباروں میں اس کا فروغ پانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ یہ سلسلہ کب سے شروع ہوا، اس کے بارے میں قطعیت سے کچھ کہنا مشکل ہے لیکن رگ وید کے زمانے سے "دان استتی" (داد و دہش کی تعریف) کا ذکر ملنا شروع ہو جاتا ہے اور داد و دہش کرنے والوں کی مدح بعض مناجاتوں میں بھی نظر آنے لگتی ہے۔ "اپنشدوں" میں ایسے بادشاہوں کا ذکر ملتا ہے جو فلسفیوں کے مقابلے کراتے اور انھیں انعام و اکرام

سے نوازتے تھے۔ ویدک زمانے کے اصنافِ سخن میں "ناراشنسی" (قصیدہ) کا تذکرہ بھی آتا ہے۔ اگر ہم اس بات کو دھیان میں رکھیں کہ ابتدا میں سارا ادب اور تمام علوم و فنون نثر میں نہیں بلکہ نظم ہی میں تھے تو عام شعرا کی اہمیت بالکل واضح ہو جائے گی اور یہ سمجھ میں آجائے گا کہ وہ معاشرتی نظام شعرا کی اتنی قدر کیوں کرتا تھا۔

ان قدردانیوں کے نتیجے میں شعرا نے اپنی قوت شعری کو منظم و مرتب کرنے کی طرف پوری توجہ مبذول کی۔ علم حاصل کرنے کے علاوہ شعر کی اثر انگیزی کا جائزہ لینے اور اس کا یقین کرنے کے لیے کہ ان کی کاوشیں شعری اسقام سے پاک ہیں ان کو یہ اہتمام بھی کرنا پڑا کہ صاحبان ذوق شعرا میں دو چار اصحاب مجتمع ہو کر ایک دوسرے کا کلام سنیں داد دیں اور لغزشوں پر ٹوکیں۔ راج شیکھر کے یہاں یہ سب اشارے موجود ہیں۔

بادشاہ اور شعرا کے یہاں اجتماعات کے علاوہ، محلوں میں رہنے والی باذوق حسینائیں بھی اس طرح کے اجتماعات میں دلچسپی لیتی تھیں۔ "مرچھا کٹیک" کی ہیروئن کے محل کی تفصیل پڑھنے سے اس کی دولت و ثروت کا ہی پتہ نہیں چلتا بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایسے محلوں میں ادب، فنون لطیفہ خصوصاً موسیقی پر مباحثے بھی ہوتے تھے جن میں حصہ لینے والے ذہنی لذت سے فیض پاتے تھے۔ یہ باذوق حسینائیں شعری ذوق بھی رکھتی تھیں اور ان میں سے اکثر و بیشتر "کام سوتر" کی عالم بھی ہوتی تھیں۔ درحقیقت عشقیہ شاعری کے لیے "کام سوتر" کی تعلیم اس دور میں لازمی سمجھی جاتی تھی۔

درباروں کی عام نشستوں کے علاوہ ہر ماہ سرسوتی کا جشن منایا جاتا تھا اس جشن میں شاعری بھی ہوتی اور شاعرانہ مقابلے بھی ہوتے رہتے تھے، مزید برآں، برہمنوں کے اظہار علم و فن کے لیے "برہمہ سبھا" کا انعقاد ہوتا تھا۔ ان میں علما کی طویل صفیں نظر

آتا تھیں۔ یہ لوگ اپنی کاوشیں پیش کرتے تھے اور ان کی خوبیوں کا اعتراف کیا جاتا تھا۔ اجین میں کالی داس، مینٹھ، امر، روپ، سور، بھاروی، ہری چند وغیرہ کے علمی خدمات کا اسی طرح اعتراف کیا گیا۔ اسی طرح پاٹلی پتر میں پانینی، نیبگل، وار وروچی، پاتن جل کو خراج تحسین ملی۔ "بھوج پربندھ" اور "ہر بندھ چنتامنی" میں شاعرانہ بزم آرائی کا نقشہ کھینچا گیا ہے لیکن اول الذکر کے مستند ہونے کے بارے میں اہل علم نے شبہات کا بھی اظہار کیا ہے۔

ان مقابلوں میں شعرا اور علما کن امور پر نظر رکھتے تھے اور شاعروں کی صلاحیتوں کا فیصلہ کیسے ہوتا رہا ہوگا؟ اس کا اندازہ ان خصوصیات سے لگایا جا سکتا ہے جو اس دور کے شعرا کے یہاں ضروری سمجھی جاتی تھیں۔ فطری صلاحیت اور ذہنی تربیت کے علاوہ مشق کو بھی ضروری سمجھتے تھے لیکن جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے، علمی لیاقت پر خاصا زور دیا جاتا تھا۔ وامن کا عقیدہ ہے کہ شاعر کو دنیاوی امور، قواعد، لغت کا پورا اور کھرا علم ہونا چاہیے۔ عروض پر بھی عبور ضروری ہے۔ اسے فنون لطیفہ، رقص و سرود اور مصوری سے بھی واقف ہونا چاہیے۔ کام شاستر کا علم تو لازمی تھا ہی۔ اس کو سیاسی اتار چڑھاؤ سے واقفیت بھی ضروری تھی۔ اس کے علاوہ، شعرائے ماسبق کا کلام پیش نظر بلکہ اس کے اجزا یاد ہونا چاہیے اور شاعری کی مشق مسلسل جاری رکھنا چاہیے اس کے لیے سحر خیزی لازم ہے، کیونکہ شاعری کے لیے یہ وقت بہت مناسب ہے۔ اس جز کی تصدیق تو کالی داس اور میگھ نے بھی کی ہے۔

اگر شاعری کا یہ معیار ہو تو اس کے پرکھنے والوں میں بھی کم از کم اتنی صلاحیت ہونا ہی چاہیے۔ اسی لیے ابتدائی شعری اجتماعات میں شرکت کے لیے شاعر ہونے کی قید

تھی جو اجتماعات بادشاہ یا دوسرے اہم شہریوں کی جانب سے منعقد ہوتے تھے ان سے بھی نہ صرف صاحب ذوق بلکہ صاحب علم ہونے کا مطالبہ بدیہی کہا جا سکتا ہے۔ "راج ترنگنی" اور "بھوج پربندھ" سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس دور میں درباری مشاعرے ہوئے ہیں، ان میں کالی داس اور میگھ جیسے شعرا روح رواں ہوتے تھے۔

ان حالات کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ شاعری ایک مستقل فن بلکہ ایک مستقل پیشہ بن گئی۔ اس میں بدیہہ گوئی پر بھی زور دیا جانے لگا۔ فوری طور پر کوئی موضوع دے دیا جاتا اور اس پر نظم مکمل کرنا ہوتی۔ اس کے لیے شاعر پہلے سے بندھے ٹکے مضامین تلمیحات، تشبیہات وغیرہ پر پورا اقتدار رکھتا کہ جیسے ہی کوئی مضمون دیا جائے وہ اس پر اشعار ڈھالنا شروع کر دے۔ اسی سے ملتی جلتی ایک تفریحی شغلہ "سمتیا پورتی" کا تھا۔ اس میں ایک یا دو الفاظ دے دیے جاتے اور اسے شاعر پورا کرتا غالباً یہیں سے طرحی مشاعروں کی ابتدا کا اشارہ ملا ہوگا۔ "بدیہہ گوئی" شعرائے ایران کے یہاں بھی ایک خصوصیت امتیازی مانی جاتی تھی۔ چنانچہ نظامی نے چہار مقالے میں اس کے حصول کی تاکید کی ہے کیونکہ اس کی وجہ "چاندی خزانے سے جلد نکلتی ہے" یعنی انعام و اکرام بآسانی حاصل ہوتا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ موضوعاتی مشاعرے ہندوستان میں قدیم سے رائج ہیں۔

جو لوگ برہما سبھاؤں اور دوسرے اجتماعات میں شعری صلاحیتوں کو پرکھتے تھے اور جن کی پرکھ کی بنیاد پر شاعروں کی اہلیت اور صلاحیت پر مہر تصدیق ثبت ہوتی تھی، خود ان کا بھی صاحب ذوق اور صاحب علم ہونا ضروری تھا۔ اسی لیے قدیم درباروں میں بادشاہ کی رائے کو متاثر کرنے والے یہی صاحبان ذوق (رسک

علما ہوتے تھے۔ چونکہ انہیں شعری تصانیف پر ماہرانہ رائے دینا اور تنقید کرنا ہوتا تھا اس لیے علوم شعر پر ان کا حاوی ہونا بھی لازمی تھا اور پھر اتنا ذوق بھی ہونا چاہیے کہ واردات قلبیہ اور کیفیات ذہنیہ کو سمجھ سکے اور اس کے طریق اظہار پر ہمدردانہ اظہار خیال کر سکے۔

شاہی سرپرستی میں شاعری کو فروغ ہوا، علم معانی و بدیع نے ترقی کی اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ شاعر درباروں کا لازمی حصہ بن گیا۔ کئی راجہ اور بادشاہ خود شاعر بن گئے۔ ان میں رودرد من، سمدرگپت، ہرش، دھار کے راجہ بھوج شاعر و ادیب تھے۔ یہ اور بات ہے کہ بعضوں نے شاہی کو ادبیت سے محروم کرنے کے لیے معاندانہ اشارے بھی کیے ہیں۔ یہ تو علم نہیں کہ کب سے لیکن کوی راج (ملک الشعرا) کا عہدہ بھی قدیم سے موجود تھا اور کشمیری وارثان تخت و تاج شعرا کو نوازتے رہے ہیں اور سوم دیو کی "کتھا سرت ساگر" ایسی ہی نوازشوں اور عنایتوں کا نتیجہ ہے۔ واسودیو، ست داہن، شدرک وغیرہ کی شاعر نوازیاں مشہور ہیں۔ بادشاہوں کو ہی نہیں شاعروں کو بھی حصول نام اور بقائے دوام کی تمنا تھی اور انھیں معلوم تھا کہ اس دور قدیم میں بادشاہوں یا کم از کم امیروں کی مدد کے بغیر دور دور تک پہونچنے والی اور باقی رہ جانے والی شہرت کا حاصل ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ بادشاہ سے توسل کے بعد شاعر بڑی حد تک فکر معاش سے آزاد ہو جاتا تھا اور اس کے لیے یہ آسان ہو جاتا تھا کہ وہ اپنا بیشتر وقت ادب و شعر کی خدمت میں صرف کر سکے۔

بہت بعد کے برج بھاشا شاعروں میں متی رام نے اشعار کو حفظ کرنے پر زور دیا ہے۔

कंक करै सो सभानि में सोभै अति अभिराम।

भयो सकल संसार हित, कविता ललित ललाम॥

یعنی سبھاؤں کی شوبھا بڑھانے کے لیے اشعار کو زبانی یاد رکھنا ضروری ہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ جس وقت بھی فرمائش کی جائے شاعر اشعار سنا سکے۔ لیکن صرف روایت پسند شعرا ہی راج سبھاؤں کی زینت بڑھانے کی تدبیروں میں مشغول نہیں رہتے تھے بلکہ وہ شاعر جو آزادانہ لکھتے تھے اور "مرو جہ ریتی" کی طرز کو پسند نہ کرتے تھے وہ بھی اسی کوشش میں رہتے تھے کہ انھیں راج سبھاؤں اور شاہی درباروں میں عظمت حاصل ہو۔

अकर सो कवि आवते मौं हि राजसभा में बड़प्पन पावै।

पंडित और प्रवीनन को जोइ चित्त हरै सो कवित्त कहावै॥

تھا کہ جو شاعر مدح سے ممدوحین کی شہرت میں اضافہ کر سکتے تھے، وہ اگر ہجو پر آجاتے تو جنھیں وہ ہدف بناتے ان کو بدنام بھی کر سکتے تھے۔ چنانچہ عرب کے دور جاہلیت میں "قطع اللسان" کا محاورہ رائج تھا۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ کچھ دے دلا کر زبان بند کر دی جائے[1]۔

عرب میں

عرب معاشرے میں اشعار پڑھنے اور سنانے کو انشاد اور نشید کہتے ہیں اس کا مفہوم گانا ہی ہوتا ہے۔ قدیم مجالس شعر میں شعرا اپنا کلام گا کر سنایا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ بعد تک جاری رہا اور بنی امیہ اور بنی عباس کے دربار خلافت میں شعرا گا کر ہی اشعار سنایا کرتے تھے۔ بعض خوش گلو شعرا نے درباروں میں بڑی مقبولیت

---

[1] A History of Arabs: P.K. Hitti : 95

اور عوام میں بڑی ہر دلعزیزی حاصل کر لی تھی۔ مثال کے لیے الداری حطیئہ اور اسحٰق موصلی وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔

جب کوئی شاعر شہرت حاصل کر لیتا تو اہلِ قبیلہ جشن منایا کرتے تھے۔ عورتیں عود و رباب پر اس کے قصیدے گاتیں۔ دوسرے قبیلے بھی خوشی کے ان جشنوں میں شریک ہو کر مبارک باد دیا کرتے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ شاعر قبائلی زندگی میں ایک اہم کردار ادا کرتا تھا۔ جنگ ہو یا صلح، وہ ہر حال میں قبیلے کی آن بان کا محافظ ہوتا تھا۔ وہ امن میں اہلِ قبیلہ کا دل بہلاتا اور جنگ میں ان کا حوصلہ بڑھاتا وہ قبیلے کی ناکتخدا لڑکیوں کی شان میں قصیدے لکھ دیتا تو ان کی شادیاں اعلیٰ گھرانوں میں ہو جاتیں۔

عرب میں شعرا کا کلام بالخصوص مدحیہ کلام شاہوں اور قائدین قبیلہ کو بقائے دوام دیتا تھا اور ممدوح بھی انھیں ہر طرح کی سہولتیں اور رعایتیں دینے کے علاوہ انعام و اکرام سے بھی نوازتے تھے۔ اس کا یہ بھی کام تھا کہ وہ دشمن قبیلوں کی ہجو کرے۔ وہ بادشاہ اور امرا کے سامنے اپنے قبیلے کے نمائندے کی حیثیت سے اپنی شعری صلاحیتوں کے جوہر دکھاتا اور اس طرح قبیلے کے لیے مراعات حاصل کرتا اور ان کی مطلب برآری کی شکل نکالتا۔ اپنے عشق و محبت کے رنگین افسانے بھی لکھتا اور انھیں مشہور کر کے سننے والوں کی توجہ اپنی اور اپنے قبیلے کی طرف متوجہ کرتا شاعر کو غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک سمجھا جاتا تھا بلکہ عوام کا تو یہ بھی خیال تھا کہ ہر شاعر کے قبضے میں ایک جن ہوتا ہے جو اسے نفیس مضامین اور اعلیٰ خیالات القا کرتا اور غیب کی باتیں بھی بتاتا ہے۔ شاعروں کو عام طور سے تین درجوں میں

تقسیم کیا جاتا تھا۔

(۱) خنذیذ، وسیع الخیال، فصیح البیان اور نادرہ کار (اسے مفلق[1] بھی کہا جاتا تھا)

(۲) شاعر، جس کا کلام متوسط درجے کا ہو، لیکن اس کے یہاں شاعری کے فطری جوہر کی موجودگی ضروری تھی،

(۳) شعریعر، شعرور یا متشاعر: جس میں طبعی ملکہ نہ ہو بلکہ علم یا مشق وغیرہ سے شاعر بن جائے یا صنایع و بدایع کی مدد سے بھونڈے اور بھرتی کے ایسے اشعار کہے جن کی بنیاد آورد پر ہو۔

عموماً پہلے اور دوسرے درجے کے شعرا ہی شہرت عام حاصل کرتے تھے۔ شہرت کا ذریعہ زیادہ تر میلے اور بازار تھے جو شعرا اپنے اپنے قبیلوں اور قرب و جوار میں نمایاں ہوتے وہ سب ان میلوں میں جمع ہوتے تھے۔ میلوں کی کامیابی کے لیے جنگجو عرب ان ایام میں جنگ و جدل بند کر دیتے اور خرید و فروخت کرتے، کاروبار کے منصوبے بناتے اور انھیں بروئے کار لاتے۔ ان مواقع پر تجار اور خریدار، معمولی حیثیت کے افراد اور رئیس و امیر، خطیب اور شاعر بھی جمع ہوتے۔ قبائل اپنی اپنی بہادری کے قصے کہتے اور سناتے، زبان دانی اور حسب و نسب کے دعوے کرتے اور اپنی فوقیت جتاتے، ناچ رنگ بھی ہوتا، گانا بجانا بھی۔ ان مواقع پر شعرا کی بڑی مانگ ہوتی اور ان کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔

میلے ٹھیلے اور شاعری

ان میلوں میں شعرا کے اجتماعات بھی ہوتے جنھیں مشاعرہ اور مقاصدہ کہا جا سکتا ہے۔ ان محافل مشاعرہ میں اپنا کلام سنانے کے لیے شعرا بہت پہلے سے اور

---

[1] بخلاف ابن رشیق نے شعرا کی چار قسمیں بتائی ہیں جن میں مفلق ایک مستقل قسم ہے (العمدہ ص۴۳)

بڑا ریاض کر کے تیاری کرتے تھے۔ عام دستور تھا کہ کسی سن رسیدہ اور باوقار اور متفق علیہ شاعر کو ثالث (حکم) یا "میر مشاعرہ" مقرر کیا جاتا۔ پھر شعرا اپنا کلام پڑھ کر سناتے اور لوگ سن کر سر دھنتے اور جب شعرا فارغ ہو جاتے تو ثالث یا میر مشاعرہ اپنا فیصلہ سناتا کہ اس سال کس شاعر کا قصیدہ سب سے اچھا رہا۔ چنانچہ اس قصیدے کو لکھ کر خانۂ کعبہ کے دروازے پر لٹکا دیا جاتا۔ یہی وہ قصیدے ہیں جن کو معلقات (لٹکائے ہوئے قصیدے) کہتے ہیں [1]

اس روایت سے یہ گوشہ نکلتا ہے کہ ہر میلے کا منتخب قصیدہ خانہ کعبہ کی دیوار پر آویزاں کر دیا جاتا تھا لیکن ایک اور روایت کے مطابق یہ شرف صرف بازار عکاظ میں پڑھے جانے والے بہترین قصیدے کو حاصل تھا۔ یہاں کے شہکار قصیدے کو قباطی (مصر کے بنے ہوئے ریشمی کپڑے) پر سونے کے پانی سے لکھ کر دیوار کعبہ پر آویزاں کر دیا جاتا تھا تاکہ لوگ اسے سال بھر تک دیکھتے رہیں اور اگر اس میں کوئی بات قابل اعتراض پائیں تو اس کی نشاندہی کریں ورنہ قصیدے کی اہمیت تسلیم کریں۔ اس کے بعد اس قصیدے کے شاعر کو ملک الشعرا مان لیا جاتا تھا اور اس کا شمار چوٹی کے شعرا میں ہونے لگتا تھا۔

یہاں یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ بعض افاضل کی رائے میں یہ قصائد آویزاں نہیں کیے جاتے تھے بلکہ جس قصیدے کو عرب بادشاہ پسند کر لیتے تھے اس کے بارے میں یہ حکم دیتے تھے کہ وہ قصیدہ ان کے خزانے میں لٹکا دیا جائے۔ پھر یہ قصائد آب زر سے لکھ کر خزانہ شاہی میں داخل کر دیے جاتے تھے۔

بعض تو "سبعہ معلقہ" (وہ مشہور سات قصیدے جو خانۂ کعبہ میں آویزاں ہونے)

(حاشیہ ص ۳۵۷ پر ملاحظہ ہو)

کی حقیقت کے ہی سرے سے انکاری ہیں۔ ان کا یہ قول ہے کہ یہ بعد کی ایجاد ہیں۔ ان کے خیال میں "سبعہ معلقہ" کی تحریک بہت بعد میں شروع کی گئی اور اس کے دائرے میں وہ تمام قصائد لیے گئے جو سب سے زیادہ مشہور ہوئے۔ پھر قصائد کے اشعار کے بارے میں بھی عام طور سے یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ اس میں بہت سا حصہ الحاقی ہے۔ جو شعری راویوں کی ذہانت کا مرہون منت ہے لیکن ہم کو اس بحث میں زیادہ الجھنے کی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ یہ ایک کھلی ہوئی سچائی ہے کہ ان میلوں ٹھیلوں اور بازاروں میں شعری مسابقے اور مشاعرے ہوا کرتے تھے، جن میں مرد ہی نہیں عورتیں بھی حصہ لیتی تھیں۔ ان مسابقوں کی بدولت شعرا کا کلام عربوں کے مختلف قبیلوں میں پھیل جایا کرتا تھا۔ اور عام ہو جاتا تھا بادشاہ اپنے خزانوں میں محفوظ کراتے اور بعد ہی میں سہی ان میں سے کچھ دیوار کعبہ پر آویزاں بھی کیے جاتے تھے۔ ادب عربی میں اصحاب معلقات کا ایک خاص مقام ہے۔ ان کی قدامت ابھی معرض بحث میں ہے اور ان کا جتنا کلام محفوظ رہ گیا ہے اس میں الحاق کے امکان سے انکار ناممکن ہے۔

قصائد کے پہلے رجز لکھے جاتے تھے اور ان میں بھی شعرا نے بڑی طبع آزمائیاں کی ہیں اور شہرتیں حاصل کی ہیں۔ میلوں ٹھیلوں کی صحبتوں میں قصائد ہی نہیں رجز بھی سنائے جاتے تھے لیکن زیادہ قدیم رجز ضایع ہو گئے۔ قصائد حماد الراویہ (۱۵۶ھ) کی بدولت باقی رہ گئے۔ عام طور سے مہلہل ابن ربیعہ کو پہلا قصیدہ نگار قرار دیا جاتا ہے۔ اس زمانے کے سیکڑوں قصیدہ گو تو گذرے ہوں گے لیکن معلقات کی تعداد سات مانی گئی ہے۔ یہ سات شعرا کے سات شہ پارے مشہور تو ہو گئے ہیں لیکن بحث

---

[1] عربی ادب کی تاریخ: ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی: ۶۸-۶۷ (ترقی اردو بیورو ۱۹۷۹ء)

اس مسئلے میں آپڑتی ہے کہ وہ سات قصیدہ گو کون ہیں جنکے قصیدے آویزاں کیے گئے اور
چونکہ شاعروں نے ایک سے زیادہ قصیدے کہے ہیں۔ اس لیے یہ بھی سوال اٹھا کہ وہ
سات قصیدے کون سے ہیں۔ ان قصائد اور قصیدہ نگاروں کے بارے میں
اختلاف ہے علی العموم یہ گیارہ نام الٹ پھیر کے لیے جاتے ہیں کہ انھیں میں سے کوئی ہوگا:

(۱) امراء القیس

(۲) زہیر ابن ابی سلمیٰ

(۳) طرفۃ بن العبد

(۴) لبید بن ربیعہ

(۵) عمرو بن کلثوم

(۶) عنترۃ بن شداد العبسی

(۷) الحارث بن حلزۃ الیشکری

(۸) النابغۃ الذبیانی

(۹) الاعشیٰ قیس

(۱۰) عبید بن الابرص

(۱۱) علقمۃ الفحل

بعض نے عبید بن الابرص کا ذکر اصحاب المجمہرات میں اور علقمہ کا اصحاب المنتقیات
میں کیا ہے۔ لیکن یہ اس بحث کو طول دینے کا محل نہیں ہے کیونکہ ہمارا مقصد صرف
یہ ظاہر کرنا تھا کہ میلوں ٹھیلوں میں شعرا کے مسابقے اور مقابلے ہوا کرتے تھے اور
جس کا قصیدہ زوردار اور جان دار مانا جاتا اس کو شہرت ملتی اس کا کلام نمائش کے

طور پر آویزاں ہوتا، خزائن میں محفوظ کیا جاتا اور زبان زد خاص وعام ہو جاتا تھا۔ ایسے
قصائد کی تعداد سَو کے قریب بتائی جاتی ہے کیونکہ ان مسابقوں کا سلسلہ ایک صدی
تک جاری رہا۔ یعقوبی کی 'اسواق العرب' ابن حبیب کی 'المحبر' یاقوت حموی کی 'معجم
البلدان' اور اصفہانی کی 'کتاب الاغانی' سے بازاروں اور مجلسوں کے بارے میں مزید
مواد حاصل کیا جاتا ہے۔ عام تاریخ ادب اور تاریخ عرب سے بھی مزید مطالب
اخذ کیے جا سکتے ہیں۔

سارے عرب میں کئی میلے لگتے تھے اور مختلف مقامات پر مختلف اوقات میں
یہ میلے لگتے تھے۔ اس طرح شعرا بھی ایک سے زیادہ میلوں کے شعری مسابقوں اور
مشاعروں میں شریک ہو سکتے تھے۔ مثلاً دومۃ الجندل کا میلہ یکم ربیع الاول سے شروع
ہوتا تھا۔ اسی طرح ہجر، عمان، حضرت موت، عدن اور صقار کے میلے منعقد ہوتے
تھے سب کے آخر میں عکاظ کا میلہ لگتا تھا۔ عکاظ کا میلہ ۵۴۰ء یا ایک قول کے
مطابق ۵۷۱ء میں شروع ہوا اور اسلام کے بعد بھی جاری رہا۔ ۷۴۶-۴۷ء / ۱۲۹ھ
تک یہ سلسلہ چلتا رہا اور پھر ختم ہو گیا[1]۔ مقامی حیثیت کے میلے تو کئی ایک تھے۔ موسمی،
ہفتہ وار اور ماہانہ میلے ان کے علاوہ تھے۔ لیکن۔ بین عرب میلوں کی حیثیت تین
میلوں کو حاصل تھی۔ (۱) عکاظ (۲) ذو المجنہ (۳) ذو المجاز۔ مقامی میلوں میں تمام
مقامی شریف جمع ہوتے تھے لیکن بین عرب میلوں میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ
آتے، سیکڑوں دوکانیں لگتیں، سیر و تفریح کا سامان ہوتا اور یہاں ہر طرف کے
اعراب کا مجمع ہوتا۔ ان تینوں میلوں کے منتخب قصائد خانۂ کعبہ پر لٹکائے جاتے تھے۔

---

[1] عربی ادب کی تاریخ: ۶۸

عکاظ مکہ سے تین میل دور نخلہ اور طائف کے درمیان اور موجود شمالی یمن کے دارالسلطنت صنعاء کی راہ میں پڑتا تھا۔ ویسے تو یہ ایک گاؤں تھا لیکن میلے کے زمانے میں خیموں کا ایک چھوٹا سا شہر بن جاتا تھا۔ یہاں کے شعری مقابلوں (مقاصدوں) کے لیے دور دور سے شاعر آتے تھے اور اسی لیے یہاں پڑھے جانے والے کلام کی شہرت بھی دور دور تک پھیل جاتی تھی اور کلام کو نئی زندگی ملتی تھی۔ حسان کا قول ہے:

سَأَنْشُرُ اِنْ حَیِیْتُ لَهُمْ کَلَامًا سَیُنْشَرُ فِی الْمَجَامِعِ مِنْ عکاظ

ان مقابلوں میں کسی بزرگ شاعر کو میر مشاعرہ بنا دیا جاتا تھا۔ النابغۃ الذبیانی کو یہ سعادت کئی بار نصیب ہوئی۔ میر مشاعرہ کے لیے سرخ رنگ کے چمڑے کا ایک خاص طرح کا خیمہ نصب کیا جاتا تھا اور اسے عزت و احترام سے رکھا جاتا تھا۔

ان مشاعروں میں گا کر پڑھنے کا بھی رواج تھا۔ مثال کے طور پر الاعشیٰ اپنا کلام گا کر سناتا تھا۔ اسی بنا پر اس کا نام صناجۃ العرب (عربوں کا جھانجھ) رکھ دیا گیا تھا۔ یہ رواج بعد تک قائم رہا۔ ہارون الرشید تو قصیدے تک گوا کر سننا چاہتا تھا۔ جن کی آواز اچھی نہ ہوتی وہ کم سن خوش گلو بچوں سے اپنا کلام پڑھواتے تھے۔

عرب کے بازاروں اور میلوں کے شعری اجتماعات مختلف مقامات پر سال کے کسی نہ کسی مہینے میں ہوتے تھے۔ عورتیں بھی مشاعروں میں شریک ہوتیں بلکہ عملی حصہ لیتیں اور اشعار پر تنقید کرتیں۔ تنقید بھی تعریف ہی کی طرح عام تھی۔ اس لیے شعرا محنت سے قصائد لکھتے تھے۔ بعض شاعر تو سال بھر اپنے قصائد پر نظر ثانی کرتے رہتے تھے بدیہہ گوئی کا ذکر بھی اکثر کتابوں میں آیا ہے۔

ان میلوں میں اور دوسری جگہوں پر مفاخروں اور منافروں کا بھی انعقاد ہوتا تھا۔

تمام قبائل کو اپنی نسبی اور معاشرتی برتری پر ناز ہوتا تھا کبھی دو شخصیتوں میں حسب و نسب کی برتری پر جھگڑا ہو جاتا تو متعلقہ قبائل کے شعرا جمع ہو جاتے اور مفاخرت و منافرت کے قصائد پڑھتے۔ عام طور سے یہ قصائد یا رجز یہ اشعار فی البدیہہ کہے جاتے تھے اور سربراہانِ قبیلہ حکم بن کر فیصلہ کرتے تھے کبھی کبھی ان مشاعروں کے نتیجے میں خوفناک جنگیں بھی رونما ہوئی ہیں۔ اس طرح کے ایک مفاخرے کا ذکر السید محمود شکری الآلوسی نے اپنی کتاب "بلوغ الادب" حصہ اول[1] میں کیا ہے۔ یہ مفاخرہ نعمان بن منذر، شاہ حیرہ کے دربار میں ہوتا تھا اور اس میں عامر بن الطفیل اور بسطام بن قیس شریک ہوئے تھے بعض معاصروں کے سلسلے میں ہم طرح قصائد بھی مل جاتے ہیں لیکن یہ عام دستور نہیں تھا۔

ادبی مجالس | تاریخی اعتبار سے ان میلوں اور بازاروں کے پہلے ادبی مجلسیں وجود میں آ چکی تھیں۔ ان کی حیثیت گاؤں کی چوپالوں اور امراء و شرفاء کی بیٹھکوں اور دیوان خانوں کی سی تھی۔ ان مجالس کو "نادی" (جمع اندیہ) کہتے تھے۔ ان میں عام دلچسپی کے امور پر تبادلۂ خیال بھی ہوتا تھا۔ پنچایتی فیصلے بھی ہوتے تھے۔ بادیوں میں بھی ان کا رواج تھا۔ ان میں شعرا اپنا کلام بھی سناتے تھے اور شعر و شاعری اور حسب و نسب پر مفاخرہ بھی کرتے تھے۔ حکومتی مجالس جیسے قریش کی نادی اور جوار کعبہ کا دارالندوہ اس سے مختلف تھا کیونکہ ان کا تعلق بنیادی طور سے نظم و نسق امور عامہ اور قبائلی مسائل سے ہوتا تھا۔ اس کے باوجود یہاں بھی شعرا اپنا کلام سنایا کرتے تھے۔ بادشاہوں اور امیروں کے محلوں میں شہرت یافتہ شعرا زیادہ جاتے تھے اور وہاں کی مجلسوں میں اپنا کلام سناتے تھے۔

---

[1] بلوغ الادب، حصہ اول: ۲۹۹ بحوالہ مضمون "مشاعرے کا ارتقا اور اس کی اہمیت" اردو، لاہور اپریل ۱۹۳۵ء: ۱۲۹۔

ادبی مجالس کا حلقہ محدود ہوتا تھا۔ اس لیے شعر کی تنقید کے مواقع زیادہ تھے اور یہاں کے تربیت یافتہ شعرا بڑے اسواق اور میلوں میں جوہر طبع دکھانے کے لیے زیادہ آمادہ و تیار ہوتے تھے۔ ان کی ابتدائی شہرتیں بھی یہیں سے شروع ہوتی تھیں اور بازاروں کے اجتماعات میں جوان ہوتی تھیں۔

شعرا باہم بھی ملتے تھے اور ان سے آپس میں بھی مسابقے ہوا کرتے تھے۔ ابتدائی دور میں تحریر مفقود تھی لیکن اس کمی کو راویوں نے پورا کیا۔ ان کی بے پناہ قوت حافظہ اپنا جواب نہیں رکھتی۔ کہتے ہیں کہ حماسہ کے مصنف ابوتمام کو چودہ ہزار مختصر قصیدے یاد تھے۔ ان کے علاوہ کچھ بڑے قصائد اور چھوٹی نظمیں بھی تھیں۔ حماد الراویہ کو ۲۷ ہزار قصائد ازبر تھے۔ اس کے علاوہ ہر حروف تہجی کے ایک ہزار قصیدے یاد تھے اسی طرح اصمعی ۱۶ ہزار چھوٹے قصیدے کی زبانی روایت کرتا تھا۔ ابوضمضم ایک سو شعرا کے اشعار کی روایت کرتا تھا اور ان شعرا میں سے ہر ایک کا نام عمرو تھا۔ شعر و شاعری سے اتنا انہماک شاید ہی کسی اور زبان کے حصے میں آیا ہو۔ عام لوگوں کو اتنے نہ سہی تو بھی کافی شعر یاد رہتے ہوں گے۔ اسی لیے وہ شاعر زیادہ پنپے جو عوامی جذبات پر مبنی شعر کہتے رہے اور جنھوں نے سہل و سادہ زبان کو اپنایا۔ صناعی کی شاعری کو قبول عام نہ ملا اور وہ عام مشاعروں میں کم پنپی لیکن خاص ادبی مجلسوں میں اس نے بھی خلعت قبول پایا اور شہرت کے علاوہ انعام و اکرام سے نوازی گئی۔

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کی یاد میں

از محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی رفیق دار المصنفین،

بڑی شخصیتوں کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ دور سے تو ان کے گرد رعب کا ہالہ نظر آئے لیکن قریب ہونے پر وہ محبت و شفقت میں بریشم کی طرح نرم محسوس ہوں، سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم، دار المصنفین کے ناظم اور معارف کے مدیر تھے، مورخ، محقق اور ادیب تھے بزم صوفیہ، بزم مملوکیہ اور بزم تیموریہ جیسی اعلیٰ درجہ کی کتابوں کے مصنف تھے، اس لیے اہل علم کی نظر میں صاحب قدر و منزلت تھے، ان کی ظاہری عظمت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کی میراث و روایات کے امین و پاسبان تھے مگر جنھوں نے ان کو قریب سے دیکھا، انھوں نے محسوس کیا کہ علم کے اس تناور درخت کے نیچے محبت، مروت اور شفقت کا خنک سایہ بھی ہے جو کسی انسان کی خوبیوں کا اصل پیمانہ ہے۔

ان کے علمی و ادبی کارناموں پر مختلف اصحاب علم و قلم پہلے بھی روشنی ڈال چکے ہیں اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا، معارف میں ان کے سنجیدہ، باوقار اور پُر مغز شذرات میں ان کے اسلوب کی ندرت و شگفتگی اور رعنائی و بانکپن کی نشاندہی کی جائے گی، ان کے سفرناموں کی دلکشی و دلآویزی اپنی جانب متوجہ کرے گی، ان کی مخصوص انشاپردازی کا تجزیہ بھی کیا جائے گا، مگر جن کی نظر میں ان کی ہر دم رواں، متحرک اور سراپا عمل شخصیت کی تصویر ہے ان کے لیے اپنے مشاہدات و تاثرات کو قلمبند کرنا بہت دشوار ہے۔

راقم نے ان کو اس وقت دیکھا جب ان کی زندگی کی شام ہو چکی تھی، مگر ان کے علمی انہماک، انتظامی مشاغل اور ان کی غیر معمولی قوت عمل میں اس وقت کوئی فرق آیا تھا اور نہ ان پر ضعف و اضمحلال اور تکان کے آثار دکھائی دیتے تھے، تصنیف و تالیف کی ذمہ داری ہو، معارف کے لیے مضامین کی فکر ہو، شذرات کی تیاری ہو، روزانہ بیسیوں خطوط لکھنے کا فریضہ ہو، دفتر کی مشکلات ہوں یا پریس کے مسائل ہوں، ان سارے مشکل مراحل سے وہ بڑی آسانی و خوبی کے ساتھ گزر جاتے، ظہر کی نماز کے بعد جب دفتر بند ہو جاتا تو وہ اپنے برآمدہ میں قرطاس و قلم کی دنیا میں گم ہو جاتے، عصر کے بعد پھر وہی کرسی اور میز ہوتی اور صریر خامہ نوائے سروش بنا ہوتا، موسم بدلتے رہتے مگر اس نظام الاوقات میں کوئی تبدیلی نہ ہوتی، جب کسی سفر سے وہ واپس آتے تو فوراً دفتر و کتب خانہ میں اس طرح مصروف عمل ہو جاتے جیسے بستر استراحت سے اٹھ کر ترو تازہ چلے آئے ہوں، اس ریاضت و مشقت بلکہ جاں سوزی و جگر کاوی کا اصل سبب بھی پوشیدہ و مخفی نہیں تھا، دارالمصنفین سے ان کو عشق ہی نہیں تھا بلکہ یہ ادارہ ان کا واحد مقصد حیات بن گیا تھا کسی ادارہ سے اس کے سربراہ کے اس درجہ تعلق کی مثالیں اب شاذ و نادر ہی ملیں گی، انھیں یہاں کے ذرہ ذرہ سے عشق تھا، وہ عموماً شبلی منزل میں ہی چہل قدمی کرتے اور بڑے والہانہ انداز سے پیڑ پودوں، پتیوں اور پھولوں کو دیکھتے اور ہاتھوں سے مس کرتے جاتے، چاندنی راتوں میں دارالمصنفین کی خوبصورت اور باوقار عمارت کا منظر ان کے لیے تاج محل کے نظارہ سے کم نہ ہوتا،

ایک مرتبہ عرب کے ایک ممتاز عالم شیخ عبدالفتاح ابوغدہ تشریف لائے، واپس گئے تو اپنے سفرنامہ میں لکھا کہ میں نے بہت سے ملکوں کی سیاحت کی مگر علم کی مملکت

دارالمصنفین میں دیکھی جس کے قلمرو میں اپنا کتب خانہ، اپنے رفقا، اپنا پریس، اپنا دفتر اپنا گھر اور اپنی مسجد ہے، مرحوم نے جب یہ تحریر دیکھی تو ان کے چہرہ پہ انبساط و نشاط اور فخر و شکر کی سرخی دیدنی تھی، دارالمصنفین میں جب کوئی مہمان رونق افروز ہوتا تو پھر ان کی مسرت کا عالم ہی دوسرا ہوتا، مہمانوں کے آرام و آسایش کے لیے ان کی فکر اور بے چینی دیکھنے کے قابل ہوتی، وہ اکثر حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کا یہ قول دہراتے کہ اعظم گڈھ جیسی دور دراز بستی تک، جہاں سفر کی صعوبتیں بہت ہیں، کوئی آتا ہے تو محض اخلاص و تعلق خاص کی بنا پر، پاکستان سے مولانا سید سلیمان ندویؒ کے خلیفہ و مسترشد ڈاکٹر محمد اشرف پشاوری تشریف لائے، اپنی جسمانی معذوریوں کے باوجود ان کا آمادۂ سفر ہونا، جہاد سے کم نہیں، اس وقت مرحوم سید صباح الدین کے جذبہ و جوش کو دیکھ کر محسوس ہوا کہ وہ مولانا اشرف صاحب کی راہ میں بجائے پھولوں کے اپنی آنکھوں کو بچھا دینا چاہتے ہیں، دسترخوان پر وہ اپنے مہمانوں کی ضیافت کا جو دلچسپ اور عمدہ انداز اختیار کرتے وہ بھی نرالا اور انوکھا ہوتا تھا اپنی دلچسپ اور پرلطف باتوں، لطیف حکایتوں اور روایتوں کا وہ ایسا خوان بچھاتے جس کی لذت و حلاوت خوان نعمت سے کسی طرح کم نہ ہوتی۔

لذت و حلاوت تو ان کی ہر ادا میں تھی، کبھی خفگی کا اظہار اور سرزنش بھی کرتے تو سخت لہجہ کی تہہ میں لینت و مروت کے چشمے جاری رہتے، رفقا سے لے کر معمولی خدمت گزاروں تک شاید ہی انھوں نے کسی کے لیے دل آزار زبان استعمال کی ہو، نئے رفقاء سے بڑی محبت کے ساتھ کہتے کہ خوب پڑھو اور مضمون اتنی محنت سے لکھو کہ صرف ایک مضمون کو دیکھ کر یہ کہا جائے کہ علم کے افق پر ایک نیا ستارہ طلوع ہوا ہے، وہ

مولانا حاجی معین الدین ندوی مصنف مہاجرین اور مولوی محمد یونس فرنگی محلی صاحب روح الاجتماع
کی مثالیں دیتے کہ ان حضرات نے کم عمری میں کیسی عمدہ کتابیں لکھیں وہ رفقا کی علمی تربیت
بھی کرتے رہتے اور انھیں علمی زبان لکھنے اور شائستہ اسلوب اختیار کرنے کی تلقین فرماتے
جو شبلی اسکول کا طرۂ امتیاز ہے اسی وجہ سے اخبار اور غیر معیاری رسالے پڑھنے سے منع
کرتے اور کہتے کہ اس سے تمھاری تحریر میں سوقیانہ اور اخباری رنگ پیدا ہو جائے گا۔
اگر کبھی کسی سے ادارہ کے قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی ہوتی تب بھی وہ لہجہ کی
نرمی کو خیر باد نہیں کہتے، صرف بڑوں کی مثال دیتے کہ فلاں کا ریکارڈ ہے کہ انھوں نے
کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں دیا، بظاہر یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں لیکن دراصل انسان
کی عظمت کا راز انھی میں پوشیدہ ہے۔

بڑوں کی عزت اور چھوٹوں پر شفقت کی پیغمبرانہ ہدایت کا مفہوم بڑا وسیع ہے
مرحوم کی زندگی میں اس کی کار فرمائی کا مشاہدہ بار بار ہوا، ان کی محبت، عقیدت بلکہ
عشق کا مرکز، علامہ شبلیؒ کی شخصیت تھی اور یہ محض اس لیے نہیں کہ وہ مملکت شبلی کے خلیفہ
ثالث تھے یا علامہ ان کے استاذ الاستاذ تھے بلکہ ان کا عقیدہ تھا کہ علامہ شبلیؒ کی جامع
کمالات شخصیت ہندوستانی مسلمانوں کے لیے منارہ نور ہے، جلسوں اور نشستوں میں
وہ والہانہ انداز سے علامہ کا ذکر کرتے اور فرماتے کہ کسی ماہر مجسمہ ساز سے اگر یہ کہا جائے
کہ علم و فضل، تحقیق و جستجو، ادب و شعر، دیدہ وری اور خوش فکری کے سارے نقوش کسی
ایک مجسمہ میں ظاہر کر دے تو جو مجسمہ سامنے آتا وہ علامہ شبلیؒ ہی کا ہوتا، وہ خود کو مزار شبلیؒ کا
مجاور کہنے میں فخر محسوس کرتے، علامہ پر کسی بھی حلقہ سے کوئی تنقید یا نکتہ چینی ہوتی تو وہ
ان کے لیے ناقابل برداشت ہوتی، ایک بار ایک نوجوان اہل قلم نے علامہ شبلیؒ کے متعلق

بعض نازیبا الفاظ استعمال کیے، سید صباح الدین صاحب مرحوم کی نظر سے جب یہ جملے گزرے
توان کے کرب و الم کی کیفیت ان کے چہرہ سے نمایاں تھی، ایسے موقع پر وہ فرماتے کہ یہ
اسکالر اور محقق نہیں ہیں بلکہ علم و ادب کے "آتنک وادی" اور "اگرو وادی" ہیں، علامہ شبلیؒ
پر توسیعی خطبات کا سلسلہ انھوں نے شروع کیا لیکن وہ خطبات دینے والوں کے سامنے
پہلے یہ گذارش کرتے کہ کم از کم دار المصنفین کے پلیٹ فارم سے علامہ کے خلاف کچھ بھی سننے
کے لیے دل گوارا نہیں کرتا، وہ اکثر کہتے کہ اگر کسی کو علامہ سے اختلاف کا حق ہے تو
ہم کو احتجاج و مدافعت کا حق حاصل ہے،

وہ تاریخ سلف کی کسی بھی نامور ہستی پر معروضیت اور غیر جانبداری کے نام پر
عیب جوئی اور خردہ گیری کو علمی شرافت اور اعتراف کمال کے منافی سمجھتے، حضرت امیر خسروؒ
پر جب ہند و پاک کے بعض سیمناروں میں اسی قسم کی تنقیدیں کی گئیں تو وہ تڑپ اٹھے،
ان سیمناروں میں شرکت کے بعد جب دار المصنفین آتے تو نشستوں میں دکھ کے ساتھ
اس کا ذکر کرتے،

علامہ شبلیؒ کے بعد ان کے گلہائے عقیدت حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے
لیے نچھاور تھے کسی مہمان کو وہ اپنے استاذ محترم کی میز دکھاتے تو معلوم ہوتا کہ برسہا برس
کی جدائی کا غم اب بھی تازہ ہے، سید صاحب کو وہ اپنا استاذ و مربی ہی نہیں سمجھتے تھے
بلکہ اکثر فرماتے کہ میں جو کچھ ہوں ان ہی کی خاک پا ہوں، سید صاحبؒ کی صد سالہ تقریبات
کے موقع پر انھوں نے اپنی مصروفیت اور جسمانی عوارض کے باوجود دہلی بھوپال اور
پٹنہ کے سیمناروں میں اپنے رفقا کے ہمراہ ولولہ اور شوق کے ساتھ شرکت کی، ان کے
ساتھ سفر کرنا بھی ان کے چھوٹوں کے لیے خوشگوار اور مفید ہوتا، دار المصنفین کے

احاطہ میں تو ہم رعب و شفقت کی دھوپ چھاؤں کا نظارہ کرتے مگر سفر میں ذہنی تبدیلی کی کیفیت ہوتی، پرلطف باتوں کا سلسلہ شروع ہوتا، کھانے پینے کی ہلکی چیزوں کو بڑے اصرار سے کھلاتے، ایک بار پٹنہ کے راستوں سے رکشہ پر گزر رہے تھے، راستہ میں معصومیت سے بتانے لگے کہ دیکھو جب میں پٹنہ تعلیم حاصل کرنے آیا تو اسی مکان میں ٹھہرا تھا، یہ میرا کالج ہے، یہ ہماری تفریح گاہ تھی، جب وہ یہ باتیں کر رہے تھے تو نگاہیں ان کے چہرہ پر جم سی گئی تھیں، معلوم ہوتا تھا کہ ان کی آنکھوں میں بچپن کی یادوں کی ساری قندیلیں روشن ہوگئی ہیں۔

وہ تقریباً نصف صدی تک دارالمصنفین میں رہے، اس طرح اعظم گڑھ گویا ان کا وطن ثانی تھا، آبائی وطن سے سلسلہ آمد و رفت بہت کم تھا، مگر وہ اپنے بزرگوں، عزیزوں اور دور دراز کے رشتہ داروں کی خوشی اور دکھ درد کا ہمیشہ خیال رکھتے، اپنے احباب و رفقا کی خبرگیری کا بھی اہتمام تھا، ہم سمجھتے تھے کہ اعظم گڈھ میں وہ کم کسی کے یہاں آمد و رفت رکھتے تھے مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ فرصت نکال کر احباب و شناسا کے علاوہ عام لوگوں کے گھر پہونچ کر ان کی مسرت و کلفت میں شریک ہوجاتے یہی وجہ ہے کہ ان کی خدمت میں حاضر ہونے والوں میں ہر طبقہ اور مختلف مزاج و ذہنیت کے لوگ ہوتے کچھ کمیونسٹ، بعض روایتی پنڈت، قشقہ کھینچے، زنار باندھے، ان کے پاس پابندی سے آتے، آج بھی ان کے ذکر پر بعض ہندوؤں کی آنکھیں نم ہوجاتی ہیں، وہ خود بھی رقیق القلب تھے اور معمولی بات سے شدید طور پر متاثر ہوجاتے۔ اسلام اور مستشرقین کے بین الاقوامی سمینار کی اختتامی تقریر میں ان کی آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے تھے، اسلام اور تاریخ اسلام پر مستشرقین کے اعتراضات اور حملوں کی چوٹ کو علامہ شبلیؒ نے جس طرح محسوس

کیا تھا اس کا مکمل اظہار دارالمصنفین کے ذمہ قرض تھا، سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم نے اس فرض اور قرض کو جس طرح ادا کیا وہ دارالمصنفین کی تاریخ کا زریں باب ہے، اعظم گڈھ جیسے دور افتادہ شہر میں انھوں نے عالم اسلام کی ممتاز ہستیوں کی کہکشاں سجادی، مستشرقین کے خلاف اس محاذ کی صدائے بازگشت علمی دنیا میں گونجی اور اس کے ذریعہ اردو کے علمی خزینہ میں 'اسلام اور مستشرقین' کے عنوان سے پانچ عمدہ کتابوں کا اضافہ ہوا، سیرۃ النبیؐ اگر علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کے خاتمہ بالخیر کی علامت ہے تو اسلام اور مستشرقین کی یہ جلدیں سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم کے حسن خاتمہ کی بشارت ہیں، اس سمینار کی کامیابی کے لیے انھوں نے شب و روز ایک کر دیے تھے، ان کی محنت و کاوش کا جو عالم ہم نے دیکھا وہ ان کی عمر اور قوت کے لحاظ سے ایک معجزہ سے کم نہ تھا، تصنیف و تالیف میں تحقیق کے اعلیٰ معیار اور مقصد کی بلندی و پاکیزگی، ادب میں حسن و خیر کی یافت اور اس کا سلیقہ اظہار، اگر ان کو علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ سے وراثت میں ملا تھا تو عمل، استقامت، اخلاص، سادگی اور رفقاء سے کام لینے کی صلاحیت انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی ذات سے حاصل کی تھی، ڈاکٹر صاحب کے متعلق وہ کہتے تھے اور لکھا بھی ہے کہ دارالمصنفین کے گوشہ عافیت میں، ڈاکٹر صاحب کی خوبیوں کی یادوں کا چراغ اپنے دل میں ہمیشہ روشن رکھا، سادگی استغنا اور قناعت، ان کی زندگی کے نمایاں اوصاف تھے، کھانے پینے، لباس و پوشاک اور رہن سہن میں وہ 'بزم صوفیہ' کے مولف کی واقعی جھلک پیش کرتے رہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے چہرہ سے ہمیشہ مسرت و طمانیت کا اظہار ہوتا، لیکن ان کے انبساط و نشاط کا عالم اس وقت قابل دید ہوتا جب وہ ملک و بیرون ملک کے سفر پر جاتے اور

دارالمصنفین کے لیے علمی فتوحات کی سوغات لاتے، وہ بڑے لطف سے داستان سفر بیان کرتے، معارف میں ان کے سفرنامے شایع ہوتے تو وہ اہل ذوق کے لیے خاصہ کی چیز ہوتے، لیکن جب وہ حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے تو ان کی بشاشت و مسرت میں عجب وقار دیکھنے میں آیا، اپنے ہاتھوں سے رفقا و احباب کو زمزم، کھجور، ٹوپی اور تسبیح کا تحفہ پیش کیا، بار بار عرض کیا گیا کہ معارف میں اپنے اس مبارک سفر کے احوال و واردات بیان کریں، لیکن وہ ایک پرکیف لہجہ میں کہتے کہ وہاں کے تاثرات کو قلم کیسے بیان کر سکے گا، یہی وجہ ہے کہ معارف کے صفحات میں ان کے اور سفرنامے تو مرقوم ہیں مگر سفر حجاز کے نقوش صرف ان کے قلب و ذہن پر مرتسم تھے،

قلب و نظر کی طہارت و نظافت کا سب سے بڑا شاہد تو خود انسان کا اپنا باطن ہے، آخر عمر میں جب انھوں نے موتیا بند کا آپریشن کرایا تو کچھ عرصہ تک وہ خطوط اور دوسری تحریریں اپنے رفقا سے لکھواتے تھے، خوب یاد ہے کہ دارالمصنفین میں چند ناخوشگوار واقعات کے متعلق اپنے خاص احباب کو مطلع کرتے ہوئے وہ بڑے یقین سے کہتے تھے کہ مجھے اپنے پاک ضمیر و پاک نیت پر اعتماد ہے، ان کے قریب رہنے والے بھی اسی کی شہادت دیتے ہیں اپنے اسی وصف کی بدولت وہ دارالمصنفین کی کشتی کو کئی بار گرداب بلا اور تلاطم خیز موجوں سے نکال کر ساحل مراد تک لے آئے، انھوں نے دارالمصنفین کو مالی لحاظ سے ہر طرح مستحکم کیا اور اس کے ہر شعبہ کو ترقی دی، عمارتیں، کتبخانہ، پریس اور سبزہ و باغ ہو یا علم و تحقیق کے گل بوٹے ہوں، ہر شعبے میں ان کے خون جگر کی سرخی اور تازگی آج بھی جھلکتی ہے، انھوں نے دارالمصنفین کی بعض مخصوص روایات کی بھی مکمل طور سے پاسبانی کی، فرماتے تھے کہ دارالمصنفین کی کچھ اپنی تہذیبی روایتیں ہیں اور یہ روایتیں

آسانی سے نہیں بنتیں، وہ چاہتے تھے کہ روایتوں کی یہ جوئبار ہمیشہ اسی شان سے رواں دواں رہے۔

اس قابل فخر علمی ادارہ کی ترکیب کچھ ایسے عناصر سے ہوئی ہے جن کی وجہ سے اندرونی طور پر یہ ادارہ سے زیادہ ایک خاندان کی صورت میں نمایاں رہا، اس کے ناظم کو انتظامی امور کے ذمہ دار سے زیادہ خاندان کی سب سے زیادہ محترم و موثر شخصیت کی حیثیت حاصل ہوتی ہے، چنانچہ سید صباح الدین مرحوم کو ادارہ سے وابستہ ہر شخص کے خاندانی بزرگ کا رتبہ حاصل تھا، یہی وجہ ہے کہ ہر شخص کی خوشی، غم، فکر اور الجھن کو وہ اپنا ہی معاملہ سمجھتے تھے، غیر محسوس رشتوں کی یہ کشش تھی کہ جب وہ لکھنؤ کے آخری سفر یا سفر آخرت کے لیے دارالمصنفین کے گیٹ سے نکل رہے تھے تو خلاف معمول، ہر شخص ان کو وداع کہنے کے لیے وہاں موجود تھا، کسے خبر تھی کہ ایک ہفتہ کے بعد جب وہ واپس آئیں گے تو ان کا استقبال صرف اشکوں اور آہوں سے کیا جائے گا، دلوں میں طوفان قیامت بپا ہوگا لیکن زبانوں پر صرف دعا ہوگی کہ اے اللہ اپنے اس پاک ضمیر و پاک نفس بندے کو جس طرح اس دنیا میں سرخرو و سربلند رکھا، روز قیامت بھی اس کو سرفراز رکھیے۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کی قوم و وطن دوستی

از

جناب خورشید عالم ریسرچ اسکالر اودھ یونیورسٹی

انسان جس خطہ زمین میں آنکھیں کھولتا اور جہاں رہتا ہے اس سے قلبی محبت اور جذباتی تعلق کا پیدا ہو جانا فطری ہے، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے وقت مکہ مکرمہ سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ "تو کتنا بہتر شہر ہے اور مجھ کو کس قدر عزیز ہے، اگر میری قوم مجھے نہ نکالتی تو تیرے سوا کسی دوسری جگہ قیام نہ کرتا" وطن سے محبت کے اسی فطری جذبہ نے شعرا کو اپنے وطن کی ایک ایک چیز سے اظہار محبت پر مجبور کیا ہے، ہر ملک کا ذخیرۂ شعر و ادب وطنی جذبات کی ترجمانی سے مالا مال ہے۔

ہندوستان جیسا عظیم ملک جو بے شمار خوبیوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، اس امتیاز سے محروم اور خالی نہیں ہے، اس سے محبت و تعلق کا اظہار یہاں کے تمام شاعروں اور ادیبوں نے بڑے جوش و ولولہ سے کیا ہے، اردو زبان کے مشہور اہل قلم اور ملک کے نامور مورخ سید صباح الدین صاحب کی مساعی بھی اس سلسلہ میں نہایت نمایاں ہیں، انھوں نے ایسے عہد و ماحول میں جب ملک کا ایک طبقہ مسلمانوں کو حب وطن کے جذبہ سے عاری ثابت کرنے کے لیے منصوبہ بند کوششوں

میں مصروف تھا مسلم سلاطین اور ان کے عہد حکومت کے متعلق مستند کتابوں سے ہندوستان سے مسلمانوں کی محبت و شیفتگی کے جذبات کے ناقابل انکار شواہد فراہم کر دیے اور مسلمانوں کی وطن دوستی سے متعلق جو غلط فہمیاں پیدا کی جا رہی تھیں ان کی تردید میں مضامین کا انبار لگا دیا۔

سید صباح الدین عبد الرحمٰن نے علم و ادب کے مختلف میدانوں میں اپنے جوہر دکھائے ہیں لیکن ان کا خاص اور محبوب موضوع ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ ہے جس پر ان کی نظر بڑی گہری اور استادانہ تھی، اپنی اس موضوع کی کتابوں میں انھوں نے حب وطن اور قومی ایکتا کی صہبا سے لوگوں کو مخمور کر دیا ہے ایک جگہ وہ سبحۃ المرجان (غلام علی آزاد بلگرامی) کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کو ہندوستان سے شروع سے محبت رہی۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جب حضرت آدمؑ سب سے پہلے ہندوستان میں اترے تو یہاں پر وحی آئی، تو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہی وہ ملک ہے جہاں خدا کی پہلی وحی نازل ہوئی اور چونکہ نور محمدی حضرت آدمؑ کی پیشانی میں امانت تھا تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ابتدائی ظہور اسی سرزمین پر ہوا، چنانچہ آپ کی یہ حدیث بھی نقل کی جاتی ہے کہ آپ نے فرمایا تھا کہ مجھے ہندوستان کی طرف سے ربانی خوشبو آتی ہے اور حضرت علیؓ کے اس قول کا بھی ذکر آتا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ سب سے پاکیزہ اور خوشبودار مقام ہندوستان ہے، کیونکہ یہاں حضرت آدمؑ اترے اور یہاں کے درختوں میں جنت کی خوشبو کا اثر ہے۔

ان روایتوں کی سند پر چاہے کتنی ہی جرح و قدح کی جائے، لیکن ان سے اندازہ

ہوتا ہے کہ ہند کی عظمت قدما کی نظروں میں کس قدر زیادہ تھی۔ اس کا اندازہ اس سے بھی ہوگا کہ اسلام سے بہت پہلے عرب اپنی لڑکی اور معشوقہ کا نام ہندہ رکھتے تھے اور بہت سی ہندوستانی چیزوں کے نام مثلاً ہندی تلوار، صندل اور عود کا ذکر ایام جاہلیت کے شعراء کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں جنت کی تعریف میں ہندوستان جنت نشان کی تین خوشبوؤں کا ذکر ہے، مسک (مشک) زنجبیل (سونٹھ یا ادرک) اور کافور (کپور)" (سلاطین دہلی کے عہد میں ہندوستان سے محبت و شیفتگی کے جذبات ص ۹)

وہ اپنے شیخین علامہ شبلی نعمانیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کی طرح امیر خسروؒ کی شاعری کی جہانگیری کے بڑے مداح رہے ہیں۔ ان کی شاعری میں وطنی رواداری اور محبت کے جذبات کی فراوانی نے صباح الدین صاحب کی وارفتگی اور شیفتگی کی آگ کو اور بھڑکا دیا ہے۔ وہ امیر خسروؒ کے اس جوہر کا مطالعہ برابر کرتے رہے اور اپنی مختلف تصنیفات میں اس کے جلوے جابجا بکھیرتے رہے اس کے علاوہ انھوں نے "ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں" کے نام سے ایک الگ کتاب تالیف کی اس کے شروع میں ۳۸ صفحات پر مشتمل ایک مقدمہ ہے۔ جسمیں انھوں نے خسروؒ کے دواوین اور مثنویوں کے اقتباسات کا خلاصہ شستہ اور سلیس نثر میں مختلف عنوانات کے ساتھ پیش کیا ہے، اس طرح امیر خسرو کی وطن دوستی، وطن نوازی اور وطن پروری سے متعلق انکے تاثرات یکجا طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ خسرو کو ہندوستان خصوصاً دہلی سے عشق تھا وہ یہاں کی ایک ایک چیز پر فدا تھے۔ یہاں کے کپڑے، زبان، پھل، پھول، موسم، آب و ہوا، عمارتوں، علوم و فنون، یہاں کے لوگوں سب کی مدح سرائی انھوں نے جس وارفتگی

اور طرب انگیز ڈھنگ سے کی ہے اسے نثر کی شکل میں پیش کرتے وقت صباح الدین صاحب کا قلم بھی نشاط انگیز ہوگیا ہے۔ اپنے ہم وطنوں کے مذہب، زبان، تہذیب وغیرہ کی تعریف بیان کرنے میں خسرو نے جس وسیع المشربی، رواداری اور فراخدلی کا مظاہرہ کیا ہے اسے قلمبند کرنے میں مولف نے کسی بخل سے کام نہیں لیا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں:

"خسرو ہندوؤں کے تصور وحدانیت کے بھی معترف تھے اور کہتے ہیں ہندو ہمارے مذہب کے قائل نہیں، لیکن ان کے بہت سے عقائد ہم سے مشابہ ہیں، وہ خداوند تعالیٰ کی وحدت، اس کی ہستی اور قدم کے معترف ہیں، اس کی قدرت ایجاد اور اس کے رازق، خالق افعال، فاعل مختار اور عالم جز و کل کے قائل ہیں"[1]

آگے یہ لکھنے میں مذہبی تعصب ان کے قلم کے لیے سد راہ نہ ہو سکا:

"امیر خسرو ہندو مرد اور عورت میں وفاشعاری کا جو جذبہ ہوتا ہے، اس سے بھی متاثر ہوئے اور کہتے ہیں کہ ہندو اپنی وفاداری میں تلوار اور آگ سے اپنی جان دے سکتا ہے اور ایک ہندو عورت اپنے شوہر کی خاطر جل کر راکھ ہو جاتی ہے، ہندو مرد اپنے بت اور مالک کے لیے اپنی جان بھینٹ چڑھا دیتا ہے، اسلام نے ان چیزوں کو روا نہیں رکھا ہے، لیکن یہ بڑی کارگذاری ہے، اگر ہماری شریعت اس کی اجازت دے تو بہت سے لوگ اس سعادت کو حاصل کرنے میں اپنی جان قربان کریں"[2]

خسرو کو اپنے وطن اور اس کی ہر چیز سے جو انس و محبت، شیفتگی و وارفتگی رہی، اس کی تفصیل بیان کرنے میں مولف کو جو لطف و لذت ملی ہے وہ ان کے جذبہ حب الوطنی کی

---

[1] مقدمہ "ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں" ص ۳۱ [2] مقدمہ ص ۳۵۔

ترجمان ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں بھی ملک کی ہر چیز حسین اور رنگین نظر آتی ہے
اور وہ بھی خسرو کی طرح اس کے ہر ذرہ کو دیوتا سمجھ کر اس کے پجاری بن گئے ہیں، سچا
محب وطن اور قومی اتحاد کا علم بردار ہی اس قدر کد و کاوش اور دیدہ ریزی کے ساتھ
خسرو کے وطنی جذبات کو ناظرین کے سامنے پیش کرنے پر پوری طرح لطف اندوز ہو سکتا ہے،
انھوں نے اپنی اس کتاب میں بڑے ذوق و شوق سے امیر خسروؒ کے اشعار کو نثر کے قالب
میں ڈھالا ہے:

"ہندوستان[1] اور خصوصاً دہلی کے اہل علم دنیا کے تمام اہل علم سے بہتر ہیں، عرب،
خراسانی اور ترکی کے باشندے یہاں آتے ہیں تو اپنی زبان بولتے ہیں اور اپنی زبان
ہی میں شعر کہہ سکتے ہیں، لیکن ہندوستان خصوصاً دہلی کے رہنے والے اگر دوسرے
ملک جاتے ہیں تو وہاں کی زبان میں اشعار کہہ سکتے ہیں، یہاں کے لوگ عرب نہیں گئے
ہیں، لیکن وہ عربی میں اشعار اس طرح کہتے ہیں کہ ان کی جیسی فصاحت عربوں میں بھی
نہیں پائی جاتی" (مقدمہ ص ۱۷)

ہندوستان اور اس کی چیزوں سے خسرو کی وارفتگی کی داستان قلمبند کرتے ہیں تو ان کے
قلم سے بھی شہد ٹپکتا ہے اور تحریر کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ "ہندوستان کا حسن" کے عنوان
سے لکھتے ہیں:

"امیر خسرو کا خیال ہے کہ جس طرح ہندوستان کے پھول دوسرے ملکوں کے پھولوں پر
فوقیت رکھتے ہیں، اسی طرح ہندوستان کی حسین عورتیں، مصر، روم، قندھار، سمرقند،
خطا، ختن، خلخ اور تمام حسینان عالم پر اپنے حسن کی صفات میں فائق ہیں، وہ کہتے ہیں کہ

[1] یہاں ہندوستان سے مراد خسرو کے عہد کا ہندوستان ہے۔

یغما و خلخ کا حسن بھی ہندوستان کے حسن کے برابر نہیں، کیونکہ اول الذکر کے حسین
تیز چشم اور ترش رخ ہوتے ہیں، خراسان کے حسین سرخ اور سپید ضرور ہوتے ہیں
تاتاری جیسے پھول میں ویسے حسین بھی یعنی رنگ ہے لیکن بو نہیں، روس و روم ترکی
کے حسینوں میں عجز و انکسار نہیں پایا جاتا، وہ برف کی طرح سرد اور سپید ہوتے ہیں تاتاری
حسینوں کے لبوں پر ہنسی دکھائی نہیں دیتی، ختن کے حسن پر نمک نہیں ہوتا، سمرقند اور
بخارا کی خوبصورتی میں شیرینی نہیں ہوتی، مصر و روم کے سیمیں بدن ہندوستان کے
حسینوں کی طرح چالاک اور چست نہیں ہوتے" (مقدمہ ص ۲۵-۲۶)

صباح الدین صاحب ایک دیدہ ور مورخ اور حقیقت پسند مصنف تھے۔ وہ پوری زندگی
خود غرض متعصب، فتنہ پرداز اور ہندوستان جنت نشان کو جنگ و جدل کا میدان
کارزار ثابت کرنے والے انگریز اور ہندوستانی مورخین کے زہر کا تریاق فراہم کرتے اور
اپنی تمام تصنیفات میں، حب الوطنی، قومی اتحاد و سالمیت قومی یکجہتی و جذباتی ہم آہنگی، تفاہمت
رواداری اور وسیع المشربی کے جذبات کو فروغ دیتے رہے۔ ان کی کتابوں کے مطالعہ سے
ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی جڑیں خالصتاً ہندوستانی ہیں اور ان کی تحریروں میں اسی مٹی کی
بوباس ہے، ان کے مقالات اور معارف کے شذرات بھی وطن دوستی کے رنگ میں رنگے
ہوئے ہیں۔ مئی ۱۹۸۷ء کے شذرات میں ملک کے گنگا جمنی کلچر، اخوت، موانست اور
یگانگت کا ذکر کرتے ہوئے اپنے استاذ محترم مولانا سید سلیمان ندوی کی طرح اور ہندوستان
فردوس نشان کو اس طرح اپنا پدری وطن ثابت کرتے ہیں:

"مسلمان خالصتاً ہندوستانی بن کر اپنے برادران وطن سے الگ نہ رہے ہیں اور نہ
رہ سکتے ہیں۔ دونوں کی صورت شکل اور وضع قطع میں ایسی یکسانیت ہے کہ بعض اوقات

مشکل سے پہچانا جاسکتا ہے کہ کون ہندو ہے اور کون مسلمان، دونوں میں ایسے خاندان ملیں گے جن کے افراد ایک دوسرے کو حقیقی رشتہ داروں سے بڑھ کر سمجھتے ہیں، دونوں اپنے مذہبی عقائد اور رسوم الگ الگ ضرور رکھتے ہیں مگر دونوں ایک دوسرے کے مذہب کا احترام کرنے میں شریفانہ جذبہ بھی رکھتے ہیں۔ .... جہانتک ہندوستان سے محبت کا تعلق ہے مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ یہاں آریہ قوم چند ہزار برس پہلے آکر گنگا جمنا کے دوآبہ میں پھیل گئی مگر یہاں سے مسلمانوں کا تعلق صرف چند ہزار برس کا نہیں بلکہ ابتدائے آفرینش سے ہے۔ یہ ان کا پدری وطن ہے حضرت آدمؑ آسمان کی جنت سے نکالے گئے تو وہ اسی سرزمین کی جنت میں اتارے گئے، جس کو مسلمان "ہندوستان جنت نشان" کے نام سے یاد کرتے ہیں اور چونکہ نور محمدیؐ حضرت آدمؑ کی پیشانی میں امانت تھا، اس لیے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان اس کو اپنا موروثی پدری وطن سمجھتے ہیں اور جب مسلمان مستقل طور پر آباد ہو گئے تو اس سے اپنی محبت کا اظہار اس طرح کرنے لگے کہ

ع کشور ہند است بہشتے بر زمیں"

واقعہ یہ ہے کہ وہ عمر بھر ملک کی وحدت و سالمیت برقرار رکھنے کی جد و جہد کرتے رہے انھوں نے مذہبی تعصب اور فرقہ وارانہ منافرت کے شعلوں کو بجھا کر قومی یکجہتی کا چراغ روشن کیا اور میل جول اور اتفاق و اتحاد کے نکہت بیز پھول کھلائے ہیں، لکھتے ہیں:

"خسرو نے اپنی فارسی شاعری میں اپنی وطنیت کا جو راگ الاپا ہے، وہ ایک مستقل پیام ہے کہ ہم جس ملک میں پیدا ہوتے ہیں اور جہاں نشو و نما پاتے ہیں اس کا تقاضا ہے کہ اس کی ہر چیز کو محبوب رکھیں، اس کا ہر شہر اس کے باشندے، اس کی آب و ہوا، اس کی زبانیں، اس کے علوم و فنون، اس کی عورتوں کا حسن، اس کے پھول، پھل، جانور اور حتیٰ کہ اس کے جادوگر اور نٹ بھی محض اس لیے عزیز ہوں کہ یہ وطن کے ہیں"[1]

وہ کہتے ہیں کہ "مذہب کی راسخ العقیدگی، دوسروں کے مذہبی عقائد کے احترام میں کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتی، مذہب کی پابندی اور عمل میں سچا اخلاص ہو تو یہی سچائی دلوں میں فراخ دلی پیدا کر سکتی ہے، جس سے دلوں کی تسخیر آسانی سے ہو سکتی ہے"[2]۔ وہ اپنے ہم وطنوں کے دلوں کی تسخیر کے لیے مذہبی عقائد، روحانی واردات اور ذاتی خیالات کی خواہ مخواہ وحدت کو ضروری نہیں سمجھتے بلکہ سچے جذبات کے ساتھ رواداری، کشادہ دلی، وسیع المشربی باہمی مفاہمت، مصالحت، موافقت اور یگانگت کی ضرورت پر زور دیتے ہیں ان کے نزدیک عشق مذہب کے ساتھ عشق وطن کوئی متضاد چیز نہیں بلکہ شہید جنون مذہب کشتۂ محبت وطن بھی ہو سکتا ہے"۔

---

[1] سلاطین دہلی کے عہد میں ہندوستان سے محبت و شیفتگی کے جذبات ص ۱۰۱-۱۰۲۔ [2] ایضاً۔

جناب علی جواد زیدی کا مکتوب گرامی

اندھیری (ایسٹ) بمبئی۔

۱۷ اکتوبر ۹۰ء

محترمی و مکرمی زاد مجدکم! السلام علیکم

مندرجۂ عنوان پتوں کی تبدیلی سے یہ تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں لکھنؤ سے بمبئی منتقل ہو گیا ہوں۔ نیا پتہ اوپر درج ہے۔ لکھنؤ سے بمبئی کا آنا اور وہ بھی مستقل طور سے، بڑی ذہنی اذیت کا انتقال مکانی ہے بڑھاپے میں اب یہ بھی ایک منزل آنے لگی ہے کہ بچے اپنی اپنی ملازمتوں پر اور بچیاں اپنے نئے گھروں پر چلی جاتی ہیں اور بوڑھے ماں باپ تنہا رہ جاتے ہیں۔ مجھ پر اس تنہائی نے مرض دل کا اضافہ کیا اور بچے بضد ہوئے کہ اب آپ کا تنہا رہنا کسی صورت میں مناسب نہیں۔ ایک کمزور لمحے میں، میں سپر انداختہ ہو گیا جس ماحول میں زندگی گزری ہے اس سے بالکل دور اس انتہائی کاروباری شہر میں پناہ گزیں ہوں مگر میری خبرگیری کے لیے میرا چھوٹا بچہ موجود ہے اور یہ بڑی ڈھارس ہے۔ ویسے تو محافظ حقیقی اللہ تعالیٰ ہے لیکن بچے بھی اپنی حدوں میں بڑھاپے کا سہارا بن جاتے ہیں۔ بہرحال اس کا شکر ہے۔

لکھنؤ میں تھا تو سال دو سال میں وطن کا ایک پھیرا لگا لیتا تھا اور دار المصنفین کی حاضری کا فرض بھی انجام دے لیتا تھا۔ اب عمر کی پچھترویں منزل میں اتنی دور کہاں آنا جانا ہوگا۔ آپ کا بمبئی تشریف لانا ہو تو خاکسار کو ضرور یاد فرمائیے گا۔ انشاء اللہ حاضر خدمت ہوں گا۔

ادھر دو تین ماہ سے "معارف" نہیں ملا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ پتہ تبدیل نہ ہوا ہو۔ ذرا دیکھ لیجیے گا۔ آخری شمارہ اگست کا ملا تھا۔ آپ سے بڑی شرمندگی ہے کہ اب تک وہ مضمون نہ بھیج سکا جس کا وعدہ کیا تھا اب اپنی زیر طبع کتاب "تاریخ مشاعرہ" کا ایک باب بھیج رہا ہوں امید کہ پسند خاطر ہوگا۔ ایک گذارش ہے کہ اسے اولین فرصت میں شایع فرمائیں تاکہ کتاب آنے کے پہلے ہی شایع ہو جائے۔ کتاب کے دسمبر کے شروع میں چھپ جانے کی امید ہے وہ پرانا وعدہ اپنی جگہ پر قائم ہے۔ رفیقان دار المصنفین کو سلام شوق پہونچانے کی زحمت کریں۔ والسلام مع الاکرام

بندۂ خلوص

علی جواد زیدی

اخبار علمیہ

مشرق وسطی کے سیاسی اور فوجی مد و جزر سے استعماری ممالک کے ارباب اقتدار کی دلچسپی سب پر عیاں ہے، لیکن ان مغربی ملکوں کے علمی و تحقیقی ادارے جس منصوبہ بندی اور انہماک سے اپنی حکومتوں کو تعاون دیتے ہیں وہ کم اہم نہیں، لندن کے مجلہ دی مسلم ورلڈ بک ریویو کے تازہ شمارہ میں مشرق وسطی سے متعلق یورپ و امریکہ سے شایع شدہ پانچ جدید مطبوعات کا ذکر ہے ان میں تین کتابیں (1) SECURITY IN THE MIDDLE EAST: RIGIONAL CHANGE AND GREAT POWER STRATEGIES (2) CROSS CURRENTS IN THE GULF (3) THE ARAB GULF AND THE ARAB WORLD مغربی اہل قلم کی تحریروں پر مشتمل ہیں، اول الذکر کتاب واشنگٹن کے ایک ادارہ کی جانب سے منعقدہ سیمینار میں پیش کیے گئے مقالات کا مجموعہ ہے، اس میں خلیج کے تغیر و استحکام، مسئلہ فلسطین، سپر پاور، تیل اور مشرق وسطی کے عناوین کے تحت تین ابواب میں مفصل بحث کی گئی ہے، اکثر مقالہ نگاروں کی رائے میں اس علاقہ کے تحفظ کی ذمہ داری صرف مغرب کی اجارہ داری ہے، مقدمہ میں رابرٹ جی نیومان سابق سفیر امریکہ برائے افغانستان، مراکش و سعودی عرب نے اسی رجحان کے پیش نظر لکھا کہ خلیج کا مسئلہ یہی ہے کہ اس پورے خطہ کو مغرب اپنی نوآبادی سمجھتا ہے اور یہ فراموش کر دیتا ہے کہ حقائق اس نظریہ کا بالکلیہ رد و ابطال کرتے ہیں" موضوعی طرز فکر کے علمبرداروں نے اس نکتہ سے صرف نظر کیا کہ کیا امریکہ سے انصاف، استحکام، امن اور غیر جانبداری کی امید رکھی جا سکتی ہے؟ دوسری کتاب جارج کیمپ قیصر لائبریری کی جانب سے ایچ، رچرڈ سنڈلر اور جے، ای پیٹرسن نے مرتب کی ہے اس میں بھی تین اہم ابواب میں خلیج اور بین الاقوامی امور، ایران عراق جنگ اور خلیج کی تیل پالیسی پر بحث کی گئی ہے، اس امکان کا خاص طور پر تجزیہ کیا گیا ہے کہ اگر خلیج کے حالات بدل گئے تو ان کا رخ کیا ہوگا،

کتاب کے مطالعہ کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ مغربی محققین کو تیل، تجارت اور تحفظ کی تو فکر ہے لیکن علاقہ کے عوام انکی تہذیب و روایات اور انکے مذہب سے کوئی سروکار نہیں، البتہ احیائے اسلام کی مساعی انکی نظر میں خطرہ ہیں، تیسری کتاب بی آر بریڈ ہم کی ہے، یہ بھی سنہ ۷۶ء میں منعقدہ ایک سیمینار کے مقالات کا مجموعہ ہے، اسمیں خاص طور پر خلیجی ریاستوں اور دیگر عرب ممالک کے تعلقات کے سلسلہ میں سنہ ۱۹۱۶ء سے قبل کی تاریخ، عرب سیاسی اور سماجی نظریے، آبادی کے اعداد و شمار اور اقتصادی روابط اور خلیج کے تحفظ و استحکام کے مسائل زیر بحث آئے ہیں، آخر الذکر کتاب کا معیار زیادہ بلند ہے،

ایک جانب مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کو مشرق کے مادی وسائل و مسائل سے واسطہ ہے تو دوسری طرف اسلام کے پیغام اخوت و رحمت کو خود مغرب میں عام کرنے کی مبارک کوششیں بھی جاری ہیں، گذشتہ دنوں مغربی جرمنی (اب متحدہ جرمنی) میں اسلامی تنظیموں اور اداروں کا ایک اہم اجتماع ہوا جس میں تقریباً ۸ ہزار نمائندوں نے شرکت کی، شرکاء میں پروفیسر نجم الدین اربکان، محمد الہجری، عثمان یوماک، ڈاکٹر بشیر حمید اوغولاری وغیرہ بھی تھے، عثمان یوماک یورپ میں منظمۃ الرای الوطنی کے صدر ہیں انھوں نے یورپ کے دستور و قانون کے حقوق سے فائدہ اٹھا کر وہاں اسلام کے پیام انسانیت کو روشناس کرانے پر زور دیا، جسے کمیونزم اور سرمایہ داری دونوں نے گم کر رکھا ہے۔

یورپ اور غیر یورپ کے تعلقات کی ناہمواریوں میں دوسرے عوامل کے ساتھ صہیونیت بھی ایک بڑا محرک ہے، بائیس برس پہلے امریکی کانگریس کے ایک رکن پال فنڈلے نے اپنی ایک کتاب THEY DARE TO SPEAK میں اسرائیل کی امریکی لابی کے متعلق بعض رازہائے سربستہ کی نقاب کشائی کرتے ہوئے امریکہ کی سیاست، ذرائع ابلاغ، دفاعی اور علمی اداروں میں یہودیت کی کارفرمائی کی تفصیل دی تھی، یہ کتاب دس برس پہلے شایع ہوئی تھی لیکن صہیونیوں نے بڑی چابکدستی سے اس کو عالمی بازاروں سے غائب کر دیا تھا، اب سعودی عرب کے نائب وزیر اعظم عبداللہ بن عبدالعزیز نے باون ہزار ڈالر کی خطیر رقم کے عطیہ سے اسکے طبع جدید اور عالمی اشاعت کا انتظام کیا چنانچہ امریکن

ایجوکیشنل ٹرسٹ واشنگٹن کے زیر اہتمام یہ چھپ کر شایع ہوگئی ہے۔

عالم عرب سے ادھر چند عمدہ کتابیں شایع ہوئی ہیں، ان میں حافظ جلال الدین سیوطیؒ کی "الامر بالاتباع والنہی عن الابتداع" ہے جسے حسن سلیمان نے بڑی نفاست کے ساتھ ایڈٹ کرکے ادارہ ابن قیم سعودی عرب سے شایع کیا ہے، کتاب میں قرآن و حدیث کی روشنی میں اتباع کے وجوب اور اعمال و عقائد میں بدعات کی اقسام بیان کی گئی ہیں، سنت کے متعلق ائمہ سلف خصوصاً امام سفیان ثوریؒ اور امام شافعیؒ کے اقوال و آراء بھی دیے گئے ہیں، فاضل مرتب نے امام سیوطی کے سوانح میں ایک عمدہ مقالہ بھی سپرد قلم کیا ہے ایک اہم کتاب امام ابو محمد علی بن حزم کی النبذ فی اصول الفقہ ہے جسے محمد بن حمد الحمود النجدی نے مرتب کیا ہے، جو اصلاً ابن حزم کی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام کی ایک مفصل بحث پر مشتمل ہے، ائمہ اربعہ کے یہاں ظواہر پر عمل ایک بنیادی اصول ہے، لیکن ظاہریہ کو اس میں غلو کی حد تک اصرار ہے، اس لیے انھوں نے قیاس کی مکمل نفی اور علل و اسباب کی بحث کو مہمل قرار دیا ہے، یہ کتاب فقہ ظاہریہ کی نمائندہ ہے۔

ایک قابل ذکر کتاب "الاعلام الاسلامی والرای العام" ہے جسے کویت مرحوم کی جامعۃ الکویت کے استاذ ڈاکٹر محمود متولی نے مکتبۃ المنار کویت سے شایع کیا تھا، ذرائع ابلاغ کی اہمیت کا مشاہدہ دور حاضر میں اشتراکیت، صہیونیت اور مغربیت کی یلغار سے بآسانی کیا جا سکتا ہے، مصنف کے پیش نظر ایسے امکانات کی تلاش ہے جن کی بنیاد پر اسلامی ذرائع ابلاغ کی ایک مستحکم عمارت قائم ہو سکے، کتاب میں عوام کے رجحانات، تصورات، فرائض اور مشکلات، دور جدید میں دینی ذرائع ابلاغ کی ذمہ داریاں اور صحافت ریڈیو

اور ٹی وی کی اہمیت جیسے موضوعات پر علمی وفنی بحث کی گئی ہے، مصنف اپنے اسلامی جذبہ و فکر کے لیے مشہور ہیں، اس لیے ۴۰۰ صفحات کی اس ضخیم کتاب میں اسلامی دردمندی ظاہر ہے، جامعہ از ہر کے علمی حلقوں میں کتاب کو اپنے موضوع پر اولین علمی مرجع کی حیثیت دی گئی ہے۔

ادبیات میں جامعہ قطر نے ڈاکٹر یوسف حسین بکار کی نہایت عمدہ، وسیع اور جامع تصنیف 'الترجمات العربیۃ لرباعیات الخیام' شایع کی ہے، عالمی زبانوں میں عمر خیام کی رباعیات کی مقبولیت و شہرت کا بڑا سبب رباعیات خیام کا انگریزی مترجم ایڈورڈ فٹز جیرالڈ ہے، گذشتہ صدی کے اواخر میں اس کے انگریزی ترجمہ کے ذریعہ رباعیات خیام کا پر کیف نشہ دوسری کئی زبانوں پر چھا گیا، عربی بھی اس سے مستثنی نہیں اس کتاب میں فاضل مصنف نے عربی میں رباعیات کے ہر مترجم کی کاوشوں کا باہم موازنہ کیا ہے اور پھر خوب سے خوب تر کی نشاندہی کرتے ہوئے وجہ ترجیح بھی ظاہر کی ہے عیسی اسکندر علوف، ودیع البستانی، عبدالرحمن شکری، عبدالقادر مازنی، جمیل صدقی زہراوی، عباس محمود عقاد سے محمد الغراقی اور محمد غنیمی تک تقریباً ۱۲۹ ادبا و شعراء کے ترجموں کا دقت نظر سے موازنہ و تجزیہ کیا گیا ہے، مصنف کو چونکہ فارسی اور انگریزی زبانوں پر بھی قدرت ہے اس لیے انھوں نے انگریزی کے علاوہ اصل فارسی رباعیات کو بھی پیش نظر رکھا ہے، اسی لیے ایک عربی ناقد کی نظر میں کتاب جدید علمی طرز تحقیق و ترتیب کا بہترین نمونہ ہے۔

(ع - ص)

وفیات

افضل العلماء محمد یوسف کوکن مرحوم

تار کے ذریعہ یہ افسوسناک خبر ملی کہ دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے رکن اور مدراس یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ عربی و فارسی، افضل العلماء حافظ محمد یوسف کوکن کا انتقال ۲۱ اکتوبر کو مدراس میں ان کے گھر پر ہوگیا، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

انھوں نے سرزمین مدراس میں مشرقی و دینی علوم کی قابل قدر خدمت جس خاموشی محنت اور انہماک سے انجام دی اس کی وجہ سے برسوں ان کی کمی محسوس کی جائے گی۔ وہ ۴ نومبر ۱۹۱۶ء کو مدراس سے تقریباً ۹۵ میل دور ایک مردم خیز قصبہ مینمبور میں پیدا ہوئے، یہ قصبہ مشہور قلعہ جنجی سے متصل ہے، اس مضبوط قلعہ کو مسلمان فاتحین نے کئی بار اپنے قبضہ میں لیا، آخری بار نواب سعادت اللہ خاں نے ۱۱۲۵ھ میں اس پر قبضہ کیا، چونکہ ان کا تعلق نوائط سے تھا اس لیے اکثر اہل نوائط وہاں جاکر آباد ہوئے، مینمبور قصبہ کی ساری آبادی نائط مسلمانوں کی ہے جو اپنے حسب نسب، عزو شرف، دینی اور دنیوی وجاہت اور اپنے بعض مخصوص رسم و رواج کی وجہ سے جنوبی ہند میں امتیازی شان رکھتے ہیں، یہ لوگ شافعی المسلک ہوتے ہیں لیکن مینمبور کے نوائط عام طور سے حنفی ہیں، کوکن خاندان بھی حنفی المسلک ہے، گو یہ خاندان عرصہ سے مدراس میں آباد ہے لیکن اس کی مادری زبان اردو ہے اور نصف صدی قبل تک اس کی علمی زبان فارسی تھی۔

کوکن مرحوم نے جامعہ دار السلام عمر آباد میں تعلیم حاصل کی، بعد میں انھوں نے گورنمنٹ مسلم کالج مدراس سے افضل العلما، اور منشی فاضل کی سند حاصل کی، دار السلام عمر آباد کے مقاصد میں یہ بات بھی تھی کہ جامعہ کے طلبہ میں عربی اور فارسی کے ساتھ اردو کا اعلیٰ ذوق اور تصنیف وتالیف کا سلیقہ وملکہ پیدا ہو، اسی مقصد سے کوکن مرحوم کو مزید تربیت حاصل کرنے کے لیے دار المصنفین بھیجا گیا، یہاں وہ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۰ء تک مولانا سید سلیمان ندویؒ کی نگرانی میں بحیثیت رفیق علمی کاموں میں مشغول رہے، اس عرصہ میں معارف میں ان کے کئی اہم مضامین شلاً حافظ ابن القیم، امام ذہبی، نویری کی نہایۃ الارب، مسلمانوں کے مستعمل سنہ وغیرہ شایع ہوئے، یہاں کے قیام میں ان کا بڑا کارنامہ یہ بھی تھا کہ آہستہ آہستہ انھوں نے قرآن مجید کو حفظ کرنا شروع کیا اور دو تین برسوں میں مکمل حافظ بن کر دار المصنفین کی مسجد میں محراب بھی سنائی، سید صاحبؒ نے خوش ہو کر معارف کے شذرات میں خاص طور پر اس کا ذکر کیا، انھوں نے ان کے ذوق ومناسبت طبع کے پیش نظر ان کے لیے سوانح ابن تیمیہؒ کا موضوع تجویز کیا، امام ابن تیمیہ کی حقیقی عظمت ومنزلت سے اردو داں طبقہ کو سب سے پہلے روشناس کرانے والے علامہ شبلیؒ تھے، انھوں نے ۱۹۰۸ء کے الندوہ میں امام ابن تیمیہؒ کو سب سے بڑا مجدد اور اصل رفارمر ثابت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ مجددیت کی اصل خصوصیتیں جس قدر امام ابن تیمیہ کی ذات میں پائی جاتی ہیں اس کی نظیر بہت کم ملتی ہے، سید صاحبؒ کی خواہش کے مطابق کوکن مرحوم نے دو سال میں امام ابن تیمیہ کے سوانح، خدمات وتالیفات پر خاصا مواد فراہم کر لیا تھا مگر اسی عرصہ میں وہ جدید تعلیم حاصل کرنے کے لیے اپنے وطن مدراس واپس تشریف لے گئے، تاہم وہ اپنے موضوع سے کبھی غافل نہیں رہے اور برابر نئے معلومات جمع کرتے رہے، سید صاحبؒ انہیں کتاب کی اشاعت کے لیے بار بار توجہ بھی دلاتے رہے، بالآخر یہ کتاب

۱۹۵۹ء میں طبع ہوئی، ۷۲۰ صفحات کی یہ ضخیم کتاب امام ابن تیمیہ کے سوانح کا بالاستیعاب احاطہ ہے اور اپنے موضوع پر اب تک نہایت جامع ومکمل ہے۔

انگریزی تعلیم کا شوق دامنگیر ہوا تو انھوں نے مدراس یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا، جس کا شعبۂ عربی وفارسی ہمیشہ ممتاز اور اپنے لائق اساتذہ کی وجہ سے نیک نام رہا ہے، ایک زمانہ میں مولوی محمد حسین صدیقی محوی لکھنوی وغیرہ اس سے وابستہ رہے ہیں، یونیورسٹی سے کوکن مرحوم کا طالب علمانہ رشتہ ختم ہوا تو جلد ہی تدریسی ربط قائم ہو گیا، اس ماحول میں ان کی علمی صلاحیتوں کو مزید جلا ملی۔ انھوں نے جنوبی ہند اور خاص طور پر مدراس وکرناٹک کے کتب خانوں میں موجود اہم قدیم مخطوطات کی ترتیب وتدوین کو زیادہ لائق توجہ سمجھا، چنانچہ ۱۹۵۴ء میں انھوں نے میر محمد اسماعیل خاں ابجدی ملک الشعرائے دربار والاجاہی کی کلیات ابجدی کو بڑے اہتمام اور فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ شایع کیا، ۱۹۶۶ء میں ابجدی کی فارسی مثنوی ہفت جوہر بھی شایع کی، بعد میں مولوی غلام عبد القادر ناظر مدراسی کی فارسی تصنیف بہار اعظم جاہی کو فارسی اور انگریزی مقدمہ وحواشی کے ساتھ شایع کیا، فن تصوف میں سید شاہ عبد القادر مہربان فخری مدراسی کی ایک ضخیم اور اہم غیر مطبوعہ عربی تالیف اصل الاصول فی بیان مطابقۃ الکشف بالمعقول والمنقول کو بڑی محنت سے حواشی وتعلیقات سے مزین کر کے شایع کیا، اس کے علاوہ ملا جلال الدین دوانی کی شواکل الحور فی شرح ہیکل النور اور باقر آغا کی مقامات کو بھی فاضلانہ مقدموں اور حواشی کے ساتھ طبع کرایا، عربی میں انھوں نے چند درسی کتابیں مثلاً العرب وادبہم، القرآۃ العربیہ وغیرہ تیار کیں، امیر خسروؒ پر بھی ایک کتابچہ لکھا، ۱۹۵۷ء میں وہ حکومت ہند کے وظیفہ پر ایک سال کے لیے قاہرہ یونیورسٹی گئے، وہاں ڈاکٹر طہ حسین، ڈاکٹر سہیر قلماوی اور ڈاکٹر

شوقی ضیف سے براہ راست استفادہ کے نتیجہ میں ان کو جدید عربی ادب کے تغیرات اور رجحانات سے واقفیت ہوئی، بعد میں کالی کٹ یونیورسٹی میں انھوں نے اسی موضوع پر خطبات دیے جن کی تین جلدیں اعلام النثر والشعر فی العصر الحدیث کے نام سے شایع ہوچکی ہیں، پہلی جلد میں محمد علی الشیخ رفاعۃ رافع طہطاوی سے امیر شکیب ارسلان تک ڈیڑھ سو برس کے ۳۳ نامور ادبا و شعراء کا ذکر ہے، دوسری جلد میں ۵۲ مہجری ادبا وشعراء اور تیسری جلد میں احمد لطفی السید سے ڈاکٹر شوقی ضیف تک ۴۷ ادیبوں کے حالات ہیں۔ جدید عربی ادب کے مطالعہ کے لیے یہ نہایت مفید کتاب ہے، اردو میں انھوں نے نواب غلام اعزالدین خاں بہادر مستقیم جنگ کی مثنوی نوبہار عشق کو مرتب کیا، ان کی شاہکار تصنیف تو امام ابن تیمیہ ہے لیکن 'خانوادہ قاضی بدرالدولہ' بھی ان کی نہایت عمدہ تالیف ہے، یہ کتاب امام العلماء قاضی بدرالدولہ مرحوم اور ان کے خاندان کے بعض باکمال اہل علم وقلم کے تذکرہ پر مشتمل ہے، لیکن درحقیقت یہ جنوبی ہند میں عربی، فارسی اور اردو کے علوم ومعارف کی ایک مکمل اور جامع تاریخ ہے، انگریزی میں ان کی ایک وقیع کتاب ARABIC AND PERSIAN IN CARNATIC ہے، اصلاً یہ ایم لٹ کا مقالہ ہے جسے انھوں نے سنہ ۶۵ء میں تیار کیا تھا،

وہ ترجمہ کے فن پر بھی قدرت رکھتے تھے، چنانچہ ڈاکٹر الیکسس کارل کی مین دی ان نون کا ترجمہ نامعلوم انسان اور مورلینڈ اور چترجی کی اے شارٹ ہسٹری آف انڈیا کا ترجمہ مختصر تاریخ ہند کے نام سے شایع کیا۔

ان کی زندگی کا بیشتر حصہ علم وحکمت کے جواہر ریزوں کو خاموشی سے چننے، بیننے اور لڑیوں میں پرونے میں گذرا، تاہم کبھی کبھی وہ اپنے گوشۂ عافیت سے باہر بھی

نکلتے تھے، مصر وشام، لبنان وایران اور سرزمین حجاز کی سیاحت وزیارت بھی کی، وہ دارالمصنفین اور ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے ممبر تھے لیکن صلاح ومشورہ کا ربط زیادہ تر خطوط کے ذریعہ رہا، کئی برس پہلے وہ اپنی اہلیہ محترمہ کے ساتھ ایک جلسہ میں شرکت کے لیے تشریف لائے تو اپنی شرافت، نیکی اور فروتنی کا نقش ہر دل پر ثبت کرگئے، شہر میں اپنے بعض پرانے احباب کے گھر بھی گئے، آئندہ کے لیے آنے کا وعدہ کرگئے مگر دو برس پہلے ایک حادثہ میں وہ صاحب فراش ہوگئے، اسی زمانہ میں اتفاقاً مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب مدراس پہنچے تو ان کی عیادت کے لیے بھی گئے، مرحوم بڑے لطف وشفقت سے پیش آئے اور علالت و معذوری کے باوجود بڑا پر تکلف کھانا کھلایا، اب یہ خبر سن کر نہایت ملال ہوا کہ وہ اپنے خالق حقیقی سے جاملے، حیات دنیوی کی نعمت وامانت کو انھوں نے بڑی ایمانداری سے استعمال کیا اور بامقصد اور کامیاب زندگی بسر کی، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو آخرت کی اصل اور ابدی زندگی میں بھی انعام واکرام سے نوازے اور ان کی اہلیہ محترمہ اور تمام متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ دارالمصنفین کے لیے بھی ان کی موت ایک سانحہ ہے،

(ع۔ص)

باب التقریظ والانتقاد

فتاوی تاتارخانیہ (جز اول تا چہارم)

تصنیف علامہ عالم بن علاء انصاری اندرپتی دہلوی، متوفی سنہ ۷۸۶ھ، تحقیق مولانا قاضی سجاد حسین صاحب صدر مدرس مدرسہ عالیہ جامع فتحپوری، دہلی، مطبوعہ دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد دکن، تعداد مجموعی صفحات دو ہزار چھ سو چھیاسی سن اشاعت جز اول و دوم سنہ ۱۹۸۴ء، جز سوم سنہ ۱۹۸۶ء، جز چہارم سنہ ۱۹۸۷ء، مجلد مع گرد پوش، قیمت غیر مندرج

ہندوستان میں اسلامی علوم و فنون پر جو اہم کتابیں تالیف کی گئیں ان میں علامہ عالم بن علاء انصاری دہلوی متوفی سنہ ۷۸۶ھ کی کتاب فتاوی تاتارخانیہ خاص طور پر بڑی اہمیت کی حامل ہے، یہ فتاوی کی ایک انسائیکلو پیڈیا ہے جو عہد سلطنت کے ہندوستان میں حکومت کی سرپرستی میں مرتب ہوئی، مگر افسوس کہ یہ عظیم الشان کتاب ابھی تک غیر مطبوعہ تھی تاہم ملک و بیرون ملک کے مختلف کتب خانوں میں یہ غیر مطبوعہ صورت میں محفوظ تھی، خوشی کی بات ہے کہ چند برس قبل اس کی چار جلدیں زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آئی ہیں جن کو مشہور فاضل جناب مولانا قاضی سجاد حسین صاحب نے ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں موجود مخطوطات کی روشنی میں مرتب کیا ہے۔ یہ حکومت ہند کی وزارت تعلیم کے اہتمام میں شائع ہوئی ہے۔

فتاوی تاتارخانیہ برابر اہل علم اور فقہاء و مفتیان کرام کی دلچسپی و توجہ کا مرکز رہی ہے، دارالمصنفین میں بھی اس کی جانب اعتنا کیا گیا اور اس کے قدیم رفیق اور ملک کے مشہور مصنف مولانا سید ریاست علی ندوی مرحوم کے قلم سے اس پر ایک مفصل مضمون شائع ہو چکا ہے، (معارف فروری سنہ ۱۹۳۲ء و مارچ سنہ ۱۹۴۲ء) بعض علمی حلقوں میں یہ خیال عام تھا کہ یہ کتاب خان اعظم تاتارخان کی تصنیف ہے جو عہد فیروز شاہی کا ایک نامور سپہ سالار اور علم و فن کا شیدائی تھا، مگر خود کتاب کی ایک صریح عبارت سے اس کی تردید ہوئی اور اس حقیقت کا علم ہوا کہ یہ خان اعظم تاتارخان کی تصنیف نہیں بلکہ اس کے مصنف شیخ عالم بن علاء ہندی ہیں جن کے روابط خان اعظم سے تھے اور اسی تعلق کی بنا پر انھوں نے اس کتاب کو اس کے نام سے معنون کیا، تاہم مورخین کے درمیان یہ امر پھر بھی متنازعہ تھا کہ یہ تنہا شیخ عالم بن علاء کا کارنامہ ہے یا علما کی ایک جماعت نے مل کر اس کو انجام دیا ہے جیسا کہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے عہد میں فتاوی عالمگیری کی تدوین عمل میں آئی تھی، مولانا سید ریاست علی صاحب ندوی مرحوم کے خیال میں فتاوی تاتارخانیہ کی ترتیب فتاوی عالمگیری ہی کے طرز پر انجام پائی تھی، جس میں شیخ عالم بن علاء ہندی کی حیثیت میر کارواں کی تھی، مگر فتاوی کی پیش نظر چار جلدوں کے مطالعہ سے اس کی تائید نہیں ہوتی، کیونکہ ان تمام جلدوں کی عبارت میں مکمل یکسانی اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے، اس لیے خیال ہے کہ یہ تنہا شیخ عالم بن علاء کا کارنامہ ہے۔

پیش نظر کتاب کے پہلے جزء میں فاضل مرتب جناب مولانا قاضی سجاد حسین صاحب کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ شامل ہے، جس میں فقہ، اجتہاد اور تدوین فقہ کے موضوع پر بڑی تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ انھوں نے فتاوی کے مآخذ کی ایک مکمل فہرست بھی تیار

کر دی ہے جن میں ان کتابوں کو بھی شامل کر لیا ہے جن کا ذکر مصنف کے مقدمہ میں نہیں ہے
علاوہ ازیں عناوین کی فہرست نگاری کا بھی کام انجام دیا ہے،

فتاوی تاتارخانیہ کی زبان بہت سلیس وشستہ اور انداز بیان بڑا واضح ہے، متعدد مقامات پر مصنف نے فارسی الفاظ اور جملوں کا استعمال کیا ہے، البتہ کتاب میں غیر ضروری تفصیل زیادہ ہے تاہم وہ بھی فائدہ سے خالی نہیں، مختلف احکام کے استدلال میں روایتیں بھی پیش کی گئی ہیں اور ان کی نقلی اور عقلی توجیہ وتعلیل بھی کی گئی ہے مگر یہ روایتیں زیادہ تر امام غزالیؒ کی احیاء علوم الدین سے ماخوذ ہیں براہ راست حدیث کی کتابوں کا حوالہ اس میں نہیں ملتا۔ اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں عام طور سے ہندوستان میں علم حدیث کی جانب توجہ کم ہوگئی تھی غالباً اسی بناء پر اس کتاب میں خطبۂ جمعہ کے وقت خطیب کے عصا یا کمان وغیرہ پر ٹیک لگانے کو مکروہ اور خلاف سنت بتایا گیا ہے (جلد دوم ص۶۱) حالانکہ اس کے برعکس سنت یہ ہے کہ خطبہ دیتے وقت ٹیک لگایا جائے،

دیہات میں جمعہ اور فارسی میں خطبہ وغیرہ کے موضوع پر مصنف نے بڑی سیر حاصل بحثیں کی ہیں اور ان کے جواز وعدم جواز کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لے کر مختلف صورتیں بتلائی ہیں، اسی طرح شوال کے چھ روزوں کے بارہ میں بڑی عمدہ تفصیلی بحث کی گئی ہے (جلد دوم ص۶۰ ومابعد اور ص۳۸۹)

اس کتاب سے اس عہد میں فروعی مسائل میں لوگوں کی شدت پسندی اور غلو کا بھی اندازہ ہوتا ہے، چنانچہ مصنف نے امام ابوحفص سفکردری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ کوئی حنفی شافعیہ عورت سے نکاح نہیں کر سکتا (جلد سوم ص۱۰) اسی طرح اس میں اس دور میں رائج دہلی کے ناپ وتول کے پیمانے، لباس وغذا اور تہذیب وتمدن سے متعلق

بعض دوسری چیزوں کا علم ہوتا ہے۔

فاضل مرتب نے ان جلدوں کو بڑی محنت تحقیق اور عرق ریزی سے مرتب کیا ہے جس کے لیے وہ اہل علم کے شکریے کے مستحق ہیں۔ اس کی طباعت دائرۃ المعارف کے روایتی معیار کے مطابق نہیں ہے، کتابت کی غلطیاں معمولی ہیں جن کی اصلاح کے لیے اخیر میں غلط نامہ لگا دیا گیا ہے۔

معارف نے ساٹھ برس قبل یہ لکھا تھا کہ یہ کتاب دائرۃ المعارف سے شایع ہو، خوشی کی بات ہے کہ یہ توقع یک گونہ صحیح ثابت ہوئی، لیکن باقی جلدوں کی اشاعت کے التوا سے تشویش ہے، فاضل مرتب نے تو اپنا کام مکمل کر دیا ہے، اب ساری ذمہ داری دائرۃ المعارف اور مرکزی حکومت کی وزارت تعلیم کی ہے۔ دونوں کو اس ضروری کام کی جانب پوری توجہ دینے کی ضرورت ہے، ان کی اشاعت سے علم اور ملک دونوں کی خدمت ہوگی۔

(ع ۔ ع)

رسالوں کے خاص نمبر

شاعر اقبال نمبر:۔ مرتبہ جناب افتخار امام صدیقی، صفحات ۲۸۰، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۵۰ روپیے، پتہ: ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب بمبئی ۴۰۰۰۰۸۔

علامہ اقبال کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں پر متعدد کتابیں اور مضامین شایع ہو چکے ہیں ان پر اکثر رسالوں کے ضخیم نمبر بھی نکلتے رہے ہیں، اردو رسالوں میں ماہنامہ شاعر خاص نمبروں کی اشاعت کے لیے ممتاز ہے، اس کے ایک سے بڑھ کر ایک خاص نمبر

شایع ہوتے رہے ہیں ۸۸ء میں اس کا یہ اقبال نمبر بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔
اس میں آفتاب تازہ، معجزۂ فن، ادبی فیچر، سفرنامہ، اقبال کے شاہین، اقبال پر چار کتابیں،
تصانیف اقبال، نوادرات اقبال، علامہ اقبال اور ان کے اہل و عیال کے ابواب کے
ذیل میں ایسے مفید اور بیش قیمت مضامین یکجا کر دیئے گئے ہیں جن کی وجہ سے یہ خاص نمبر
دستاویزی اہمیت کا حامل بن گیا ہے۔ باب اول میں اقبال البم نسب و خاندان اقبال،
توقیت اقبال اور سیماب اکبرآبادی کی ایک نظم "نذر اقبال" درج ہے، باب دوم میں اقبال
کی تاریخ ولادت، ان کے والد کا نام، شپنگلر سے ان کا تقابلی مطالعہ، قادیانیت اور
احمدیت کے بارہ میں اقبال کا تاثر و طرز عمل، اقبال کا تنقیدی مطالعہ شعور، فلسفۂ انقلاب،
تہذیبی رویہ، اور ان کی خطابت و شاعری پر بسوط مضامین ہیں، باب سوم میں اقبال
کے ترانہ ہندی کا تنقیدی مطالعہ اور ان کی نظم مسجد قرطبہ کے اسلوب کا جائزہ لیا گیا
ہے، باب چہارم میں ان کے سفر بنگلور کے واقعات کی تفصیل ہے۔ باب پنجم میں لمعہ حیدر
آبادی کے علامہ اقبال سے تعلقات، کلام لمعہ کا انتخاب اور اقبال کے ایک معنوی شاگرد،
افسر سیمابی کے مجموعۂ کلام خاورستان کا جائزہ و انتخاب پیش کیا گیا ہے اور نبیرۂ اقبال
آزاد اقبال کے کلام کا نمونہ دے کر اس میں اقبال کے رنگ و انداز کی نشاندہی کی گئی ہے۔
باب ششم میں اکبری اقبال (کلام اقبال برنگ اکبر الہ آبادی) مظلوم اقبال (از شیخ اعجاز احمد)
اور خد و خال اقبال (امین زبیری) کا مکمل عکس دیا گیا ہے، امین زبیری کی کتاب کے رد
و کد کا اثر زائل کرنے کے لیے رفیع الدین ہاشمی کا مضمون، خد و خال اقبال ایک مطالعہ
بھی شامل کر دیا گیا ہے، اسی باب میں اقبال کے قیام یورپ پر کئی مضامین ہیں جن میں انکی
یورپ میں تعلیم اور دوسری دلچسپیوں کے علاوہ وہاں کی علمی و ادبی شخصیتوں سے

ان کی خط و کتابت اور یورپ میں تصانیف اقبال کی اشاعت کی تفصیل ہے، معلمہ مس ویگے
ناسٹ کے نام ان کے ۱۲ انگریزی و جرمن خطوط کا عکس مع ترجمہ درج ہے۔ باب ہفتم
میں مکاتیب اقبال کے ۱۷ مجموعوں اور ان کی ۱۰ نثری کتابوں کا تعارف ہے۔ تصانیف
اقبال میں سے ہر ایک کا تعارف اور ان کے اولین نسخوں کا عکس بھی شامل ہے۔ باب ہشتم
نوادرات اقبال کا مرقع ہے اس میں اقبال کے نادر خطوط، نایاب کلام، ان کی یادگار تصانیف
اور اہم تقریبات کی تفصیل ہے۔ اس باب کے آخر میں اکبر علی خاں عرشی زادہ کی کتاب
"علامہ اقبال اور ان کے اہل و عیال" شایع کی گئی ہے جو اس ضخیم نمبر کے ذریعہ منظر عام
پر آئی ہے، ماہنامہ شاعر اردو کا قدیم اور اہم مجلہ ہے جو سیماب اکبرآبادی اور اعجاز صدیقی
کی یادگار ہے اس کو ان کے لائق خلف افتخار امام صدیقی نے اس کے روایتی معیار اور شان
کے ساتھ باقی رکھا ہے، یہ اقبال نمبر بھی اس کی دیرینہ روایات کا حامل اور علامہ اقبال کے
بارہ میں اہم ادبی، تاریخی اور علمی معلومات کا خزینہ ہے، اس کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ
اس میں علامہ اقبال کے تعلق سے بعض امور و مسائل پہلی مرتبہ زیر بحث آئے ہیں، امید ہے
کہ علمی و ادبی حلقوں میں یہ ضخیم نمبر دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

نقوش سالنامہ: ایڈیٹر، جناب جاوید، صفحات ۸۷۸، قیمت ۱۲۰ روپے،
کاغذ، کتابت و طباعت روشن، پتہ: ادارہ فروغ اردو، لاہور۔

اردو کا مشہور مجلہ نقوش، محمد طفیل مرحوم کی یادگار ہے، اس کے بے مثال اور متعدد
خاص نمبر اور سالنامے شایع ہو چکے ہیں، جاوید طفیل نے نقوش کی روایات اور معیار
کو باقی رکھا۔ ان کی ادارت میں بھی اس کے متعدد موضوعات پر خاص نمبر اور سالنامے
شایع ہوتے رہتے ہیں، یہ ۸۸ء کا اس کا سالنامہ ہے جو مقالات، افسانے، ممتاز

مفتی (ایک تفصیلی مطالعہ) حمد و نعت، نظمیں، غزلیں، انتظاریہ، یادرفتگاں، تجزیاتی مطالعہ اور تبصرہ کے زیر عنوان متنوع تحریروں پر مشتمل ہے، مقالات میں غالب کے اصلاحی دیوان کا نادر نسخہ، تشکیل افسانہ، شعور ومی میں طنز و مزاح، مغرب سے ادبی اور علمی تراجم، مولانا عبدالمجید سالک، تقریظ اور غالب کی تقریظ نگاری اور داقدی پر اہم اور مفید مضامین ہیں "افسانے" اور "حمد و نعت، نظمیں اور غزلیں" کا حصہ بھی دلکشی و رعنائی سے معمور ہے ایک حصہ ممتاز مفتی کے لیے مخصوص ہے جو اپنے افسانوں، خاکوں، سفرناموں اور انشائیوں کی انفرادیت و جدت کے لیے مشہور ہیں، اس حصہ میں ان کی خاص خاص تحریروں کا انتخاب اور ان پر محمد طفیل کا خاکہ اور سید ضمیر جعفری کا مضمون "اردو ادب کا مارشل ٹیٹو" شامل ہے۔ انتظاریہ کے تحت موسیٰ بن نصیر، پہلی طلسم ہوش ربا کی دریافت، عصمت آپا اسلام آباد میں، حج ناموں کی روایت اور اردو حج نامے اور کالم نویسی، معلومات افزا اور دلکش تحریریں ہیں۔ یادرفتگاں میں راجندر سنگھ بیدی، ماجد میاں (مولانا عبدالماجد دریابادی) صدیق سالک، پروفیسر محمد عثمان، جمیلہ ہاشمی اور احمد سعید پر تاثراتی اور واقعاتی تحریریں دی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ محمد نقوش یعنی محمد طفیل مرحوم پر کئی مضامین ہیں جن سے ان کی مقبولیت اور کارناموں کا اندازہ ہوتا ہے۔ تجزیاتی مطالعہ کے ذیل میں ڈاکٹر صفدر محمود کی کتاب "پاکستان کیوں ٹوٹا" اور چند دوسرے مضامین درج ہیں۔

یہ سالنامہ بھی نقوش کے پچھلے سالناموں اور خاص نمبروں کی طرح ادبی و تنقیدی حیثیت سے خاصے کی چیز ہے، اس کے مطالعہ سے پاکستان میں ادب کی موجودہ حالت و کیفیت کا بھی یک گونہ اندازہ ہوتا ہے۔

(ع۔ک)

مطبوعات جدیدہ

ابدی پیغام کے آخری پیغمبر — مترجم جناب سید اختر حسین ہاشمی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۶۱۸، قیمت ۷۰ روپیے، پتہ: نمبر ۱۵۳- الیف بلاک ۲ پی ای سی ایچ کراچی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور آپ کے پیغام و دعوت پر مختلف زبانوں میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں جن کا سلسلہ اب بھی جاری ہے، زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہے، اصل کتاب انگریزی میں THE LAST MESSENGER WITH A LASTING MESSAGE کے نام سے تھی جس کے مصنف پاکستانی حکومت کے ایک اعلیٰ افسر جناب ضیاء الدین کرمانی ہیں۔ یہ بائیس ابواب پر مشتمل ہے اس کے چند عنوانات حسب ذیل ہیں: آنے والے رسول کی تلاش، نظریاتی پس منظر، سماج اور عقل سلیم کا تصادم، بقائے باہمی کی صبر آزما جدوجہد، جہاد اکبیر (جہد عظیم)، غزوات، بت پرست قبائل کی مزاحمت، عیسائیوں اور یہودیوں کی مزاحمت، مساعی امن عالم، باد انقلاب، گرانقدر ورثہ، عادات و تعلیمات، ازواج مطہرات، خاندان اور گھریلو زندگی، اصحاب رسولؐ وغیرہ شروع میں مقدمہ بھی ہے اور آخر میں یہ ضمیمے دیے گئے ہیں، اسلامی نظریے کی عقلی اساس، اہل ایمان کے لیے لائحہ عمل، اسلامی نظام مملکت، یہ ایک نظر، مسلم معاشرہ کے انحطاط کے اسباب، سیرتیں اور دعوت فکر و عمل وغیرہ، مصنف کا مقصد رسول اکرمؐ

کے نام نامی سے نسبت رکھنے والے تمام امور کو پیش کرنا ہے، مگر قصداً یا غیر شعوری طور پر وہ تجدد پسندوں کی طرح ثابت اور تسلیم شدہ حقائق کے بارے میں پس و پیش میں پڑ گئے ہیں بلکہ انکار کی منزل پر پہنچ گئے ہیں مثلاً "سیرت طیبہ پر اب تک موجود تمام کتابیں دیومالائی خرافات و لغویات سے خالی نہیں" اسی طرح بعض موضوع اور کمزور روایتوں کی بنیاد پر تمام مجموعۂ احادیث کے متعلق ان کا خیال ہے کہ "یہ ایسے ذہن کی عکاس ہیں جس کی تشکیل .... بظاہر انقلاب دشمن قوتوں کے ایسے پروپیگنڈے سے ہوئی جو اصلاح و ترقی کا دشمن تھا"، ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ "حتی الامکان مناظرانہ انداز بیان سے اجتناب کیا گیا ہے" مگر بعض اجلہ صحابۂ کرام خصوصاً اہل بیت کے متعلق غیر محتاط تحریروں سے انکے اس دعوے کی تردید ہوتی ہے انھوں نے بعض خالص مذہبی عبادات و حقائق مثلاً وحی، ذکر، زکوٰۃ، استغفار الٰہی کی دوراز کار توجیہات بھی کی ہیں، جیسے وحی کی یہ تعبیر کہ "یہ اثر قبول کرنے کی ایک جبلی صلاحیت ہے جو عمل ارتقا کے بالکل ابتدائی مرحلہ میں ایک خلیہ والے ایمبا کو بھی ودیعت کیا گیا ہے"، غزوہ تبوک کی ایک وجہ یہ بتائی ہے کہ "مدینہ کی نسبت، شام کی آب و ہوا مجاہدین کے لیے زیادہ سازگار تھی"، صحابۂ کرام اور منافقین کے طبقات کے واضح فرق کے بعد یہ کہنا صریحاً زیادتی ہے کہ اصحاب رسول میں ایسے لوگ بھی تھے جن کی وفاداری اور اخلاص مشکوک تھا، سب سے ناگوار پہلو حضرات صحابۂ کرام کے متعلق غیر محتاط بلکہ نازیبا اظہار خیال ہے مثلاً "حضرت انس بن مالکؓ زیادہ سوجھ بوجھ کے آدمی نہ تھے"، "حضرت ابوذرؓ کا رویہ شدید اور غالباً بے تکا ردعمل تھا"، "حضرت علیؓ میں شاید دنیوی معاملات کی اتنی سمجھ بوجھ نہ تھی جتنی کہ ہم سمجھتے ہیں"، "حضرت خالدؓ بن ولید کو شخصیتوں کے تصادم کی وجہ سے حضرت عمرؓ کے ہاتھوں زک اٹھانی پڑی"، "حضرت عمرؓ بعض اوقات جذبات سے مغلوب ہو کر

اضطراری فیصلے کر جاتے تھے" "حضرت عبداللہؓ بن زبیر جاہ طلب، ناقابل اعتماد اور چالاک تھے"، انکے تقویٰ اور علم و فضل کی داستانیں اتنی ہی بے بنیاد ہیں جتنی کہ یزید بن معاویہ کے لہو و لعب اور فسق و فجور کے قصے"، "سعدؓ بن عبادہ تمام عمر خود کو قبائلی اور علاقائی ذہنیت سے بلند نہ کر سکے"، "حضرت ابوہریرہؓ کی بہت سی روایات ایسی ہیں جن سے اعلیٰ فکری صلاحیت کا اظہار نہیں ہوتا"، "انصار مدینہ حضرت خالدؓ سے حسد کرتے اور ان کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے تھے" وغیرہ، جو واقعات عقل کی گرفت میں نہیں آتے ان کو مصنف نے بغیر معقول دلائل کے باطل، من گھڑت اور بے بنیاد قرار دیا ہے جیسے معجزہ شق القمر کی روایت انکی نظر میں بعید از قیاس ہے، اسلام کا مقصد عالمی امن کا قیام ہے، تصوف کے سلاسل کو یہودیوں کے میسنی MASONIC نظام سے تشبیہ دی ہے فکر و نظر کی اس ناہمواری کیوجہ سے تعبیر و بیان میں بھی جا بجا ژولیدگی اور پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے مثلاً جنگ احد میں یکایک بھانڈا پھوٹ پڑے، مذہب کے معاملہ میں ۲۴ قیراط کے خالص کھرے ایمان .... خلفائے بنی عباس سے پہلے کے مصنفین کی الٹی سیدھی ڈینگیں، مسلمانوں کی تہذیبی تاریخ کے ابتدائی علمائے دین، ارباب فکر و دانش رہنما کہلانے کے ہرگز مستحق نہیں، وہ دن گزرنے کے بعد، ہم جلیس ابوموسیٰؓ اشعری کو قربانی کا بکرا بنایا گیا، سراپائے مبارک کے احوال میں ابھرا سا گوشت تیوری کی شکل کا وغیرہ، مصنف نے اپنے قائم کردہ مقدمات کے نتائج کو "شاید" "غالباً" اور "ظاہر ہے" وغیرہ کہہ کر خود ہی مجروح کر دیا ہے اگر انھوں نے حیات طیبہ اور حضرات صحابۂ کرام کی سیرت کا عطر کشید کیا ہوتا تو کتاب کا فائدہ دوچند ہو جاتا، ابتدا میں مولانا عبدالقدوس ہاشمی مرحوم کا تعارفی مضمون خاصا ہے، مجموعی حیثیت سے اردو ترجمہ سلیس اور رواں ہے،

ہمارے اسماعیلی مذہب کی حقیقت اور اسکا نظام از ڈاکٹر زاہد علی، تقطیع بڑی،

کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۷۶، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبہ بینات علامہ بنوری ٹاؤن کراچی ۵

ڈاکٹر زاہد علی سابق پروفیسر عربی نظام کالج حیدرآباد دکن، اپنی مشہور تصنیف تاریخ فاطمیین مصر کیوجہ سے علمی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں، انکی زیر نظر کتاب سب سے پہلے حیدرآباد سے ۱۹۵۴ء میں

شایع ہوئی تھی، اب مکتبہ بنیات نے اسے کراچی سے شایع کیا ہے، اسماعیلی مذہب کے بارہ میں عام رائے یہ ہے کہ اسے اسلام سے بہت کم تعلق ہے، اسکے مآخذ یہودی نصرانی اور یونانی ہیں، اسکا فلسفہ، افلاطونی فلسفہ سے ماخوذ ہے اور یہ غیبت، رجعت، حلول، تناسخ اور تعطیل و اباحت کا علمبردار ہے، اس مذہب کی باطنی تعلیم ابتدا سے راز سینہ کیطرح چلی آئی ہے، اسکے بارہ میں بہت کم لکھا گیا ہے، بعض مستشرقین نے عام اسلامی تاریخوں اور بعض غیر مطبوعہ اسماعیلی تصانیف کی مدد سے جرمن، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں اس پر چند کتابیں ضرور شایع کیں لیکن وہ مستند و معتبر حوالوں سے خالی ہیں، فاضل مصنف نے اس کمی کو محسوس کرکے پندرہ برس کی تلاش و تحقیق اور محنت و عرق ریزی کے بعد اس راز سینہ کو سفینہ میں منتقل کرنے کی کوشش کی اور اسماعیلی نظام عقائد کی ایسی روداد پیش کی جسے ابھی تک صحیح انداز سے نہیں پیش کیا گیا تھا، پوری کتاب ۳۲ ابواب پر مشتمل ہے چند عنوانات سے اسکی قدر و قیمت کا اندازہ ہوگا، توحید، شرک کی حقیقت، ادوار ثلاثہ، دور کشف، دور فترت اور دور ستر، آنحضرتؐ اور مولانا علی، مولانا علی کے بعد سات امام ائمہ مستورین، مولانا مہدی کی حقیقت، ظہور کے دس امام یمن اور ہندوستان کے دعاۃ مطلقین کا مذہبی دور، اسماعیلی دعوت کا نظام اور اسکے حدود، امام کی ضرورت عصمت معرفت، وصایت اور امامت نص، مخصوص مذہبی علوم تاویل و حقیقت، شرایع انبیاء کی تاویلیں، قرآن مجید کی بعض سورتوں اور آیتوں کی تاویلیں، حروف مقطعات کی تاویل تاویل کے مآخذ، علم حقیقت یا حقایق وغیرہ، شروع میں عرض حال اور آخر میں خاتمہ کے عنوان سے دو نہایت قابل قدر باب بھی ہیں، ڈاکٹر صاحب کی نگاہ میں مروجہ اسماعیلی عقائد میں نصرانی الٰہیات، یونانی مابعد الطبعیات اور مجوسی ایرانی اثرات کی اس طرح آمیزش کر دی گئی ہے کہ اسلامی تعلیمات یکسر مسخ ہوگئی ہیں اسلیے اس مذہب کے نظام عقائد و اعمال کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں، یہ کتاب اپنے موضوع پر بے مثال اور تقابل ادیان کے موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے بار بار مطالعہ میں آنے کے لائق ہے، البتہ طبع جدید کے وقت کتابت کے اغلاط کو درست کیا جانا چاہیے تھا، بعض جگہ ایک ہی لفظ دو املا میں جیسے حمدان اور ہمدان، بوہرے کو بھونرے لکھا گیا ہے۔　　(ع۔ ص)